اسلام
اور
سیاست
حاضرا

مفتی محمد تقی عثمانی

اِسلام اور سیاستِ حاضرہ

محمد تقی عثمانی

مکتبہ دار العلوم کراچی

طبع جدید : محرم الحرام ۱۴۲۹ھ مطابق جنوری 2008ء
ناشر : مکتبہ دار العلوم کراچی
فون : 5042280-5049455
ای میل : mdukhi@cyber.net.pk
باہتمام : محمد قاسم گلگتی

ملنے کے پتے :

☆- مکتبہ دار العلوم کراچی
☆- ادارۃ المعارف احاطہ دار العلوم کراچی
☆- ادارہ اسلامیات اردو بازار کراچی
☆- دار الاشاعت اردو بازار کراچی
☆- بیت الکتب گلشن اقبال کراچی بالمقابل مدرسہ اشرف المدارس

فہرست مضامین

مسئلہ قومیت

عالم اسلام کے مسائل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

حرف آغاز

عصر حاضر میں اسلام کے عملی نفاذ اور زندگی کے مختلف شعبوں میں نت نئے پیدا ہونے والے مسائل کے اسلامی حل کے موضوع پر میں پچھلے تیس سال سے اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ لکھتا رہا ہوں، اور ان میں سے بیشتر مضامین ماہنامہ "البلاغ" میں شائع ہو رہے ہیں۔ آج سے پندرہ سال پہلے اس قسم کے مضامین کا ایک مجموعہ "عصر حاضر میں اسلام کیسے نافذ ہو" کے نام سے شائع ہو چکا ہے جو تقریباً ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل تھا۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد بھی احقر کو اسی موضوع کے دوسرے گوشوں پر بہت سے مضامین لکھنے کا اتفاق ہوا، اور احباب کی طرف سے یہ خواہش سامنے آئی کہ ان نئے مضامین کو بھی اس کتاب میں شامل کر لیا جائے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اگر اس کتاب میں ان مضامین کا اضافہ کیا جائے تو وہ بہت ضخیم کتاب ہو جائے گی، اور ایک تو ضخامت کی وجہ سے اس سے استفادہ مشکل ہو جائے گا۔ دوسرے یہ مضامین سیاست، قانون، معیشت، تعلیم، معاشرت اور انفرادی اصلاح وغیرہ کے مختلف ابواب پر منقسم ہیں۔ اور اتنی ضخیم کتاب کا حصہ بننے کا ایک نقصان یہ ہو گا کہ اگر کوئی صاحب ان میں سے صرف کسی ایک موضوع کے مضامین سے دلچسپی رکھتے ہوں تو انہیں یہ پوری ضخیم کتاب لینی پڑے گی جس کے بہت سے ابواب شاید ان کے لئے مفید مطلب نہ ہوں۔

اس بنا پر میں نے مناسب سمجھا کہ اب ان مضامین کو ایک کتاب میں جمع کرنے کے بجائے ہر موضوع پر الگ الگ مجموعے تیار کرنا زیادہ مناسب ہو گا۔ چنانچہ احقر نے مندرجہ ذیل مختلف عنوانات قائم کر کے ہر عنوان پر ایک مجموعہ مضامین کتابی شکل میں ترتیب دیا ہے:۔ (۱) نفاذ شریعت اور اس کے مسائل (۲) اسلام اور سیاست حاضرہ (۳) اسلام اور جدت پسندی (۴) ہمارا تعلیمی نظام (۵) فرد کی اصلاح (۶) سیرت طیبہ (۷) اصلاح معاشرہ (۸) ہمارا معاشی نظام (۹) مسلمان اور قادیانیت۔

ان نو مجموعوں میں سے اس وقت ایک مجموعہ " اسلام اور سیاست حاضرہ " پیش خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کو مسلمانوں کے لئے مفید بنائیں، اور یہ احقر کے لئے ذخیرہ آخرت ثابت ہو۔ آمین

محمد تقی عثمانی

۳/ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ

انتخابات اور عوام کی ذمہ داری

نئے انتخابات

نئے انتخابات کی آمد آمد ہے، حزب اقتدار اور حزب اختلاف دونوں کی انتخابی سرگرمیاں اپنے شباب پر ہیں، اور عوام کی نگاہیں ۷ مارچ کو منعقد ہونے والے الیکشن پر لگی ہوئی ہیں۔ کیونکہ انتخابات کسی بھی ملک کی زندگی میں ایک انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور یہ موڑ کس قدر نازک اور خطرناک ہوسکتا ہے؟ اس کا اندازہ اس قوم کو اچھی طرح ہونا چاہئے جو ابھی تک ۱۹۷۰ء کے جھٹکے سے سنبھل نہیں پائی۔

حکومت پر تنقید ہر مہذب ملک میں عوام کا ناگزیر حق سمجھا جاتا ہے، اور اس حق کی ضرورت و اہمیت ناقابل انکار ہے، لیکن ہمیں اس بات کا اعتراف پوری کشادہ دلی سے کرنا چاہئے کہ ہم نے ماضی میں اس حق کے استعمال کے بہانے خود اپنی بہت سی کمزوریوں کو چھپانے کی بھی کوشش کی ہے، اور اس پہلو سے بہت کم غور کیا ہے کہ ہمارے حکام درحقیقت خود ہمارے اپنے کردار و عمل کا آئینہ ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بلاشبہ قابل صد نفرین و ملامت ہیں جو اپنی دولت کے سہارے ووٹ خرید خرید کر اقتدار تک پہنچتے ہیں، لیکن ان کے جرم میں وہ عوام بھی برابر کے شریک ہیں جو کھنکتے ہوئے سکوں کی آواز سن کر قوم و ملک اور دین و اخلاق سب کو بھول جاتے ہیں، اور پھر جب ان کے ووٹوں کے خریدار اقتدار کی کرسی پر بیٹھ کر سارے عوام کا خون نچوڑتے ہیں تو یہ اپنے گریبان میں منہ ڈالنے کے بجائے حکومت پر تنقید کے بہانے دولت کے

کسی نئے سورج کی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔

موجودہ پارلیمانی طرز حکومت میں جو حکومت بھی بر سر اقتدار آتی ہے وہ انتخابات ہی کے ذریعے اقتدار کے منصب تک پہنچتی ہے، لہٰذا اس حکومت کے تمام اعمال و افعال اس کے منتخب کرنے والے عوام کی طرف منسوب ہوتے ہیں، اور ان کی دنیوی اور اخروی ذمہ داری بڑی حد تک ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اپنے ووٹ دے کر اسے منتخب کیا۔ لہٰذا یہ انتخابات جو اگلے مہینے منعقد ہونے والے ہیں، کوئی کھیل تماشا نہیں ہے جسے بے پرواہی سے دیکھ کر گذار دیا جائے، بلکہ یہ انتہائی ذمہ داری کا معاملہ ہے، اور ملک کے ہر باشندے کا قرض ہے کہ وہ اسے پوری سوجھ بوجھ اور دیانت داری کے ساتھ طے کرے۔

اگرچہ عملی سیاست سے ہمارا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا، لیکن اسلام نے زندگی کے ہر شعبے کی طرح اس شعبے میں بھی ہمیں کچھ اصولی ہدایات عطا کی ہیں، اور آج کی نشست میں انہی ہدایات کی تھوڑی سی تشریح مقصود ہے۔

شرعی اعتبار سے "ووٹ" ایک شہادت ہے، آپ جس شخص کو اپنا ووٹ دیتے ہیں گویا اس کے بارے میں یہ گواہی دیتے ہیں کہ یہ شخص آپ کی نظر میں اسمبلی کی رکنیت یا حکومت کا اہل ہے، اور آپ کے حلقہ انتخاب میں آپ کے نزدیک اس منصب کے لئے اس شخص سے زیادہ کوئی موزوں نہیں ہے۔ لہٰذا "ووٹ" پر شرعی اعتبار سے وہ تمام احکام جاری ہوتے ہیں جو شہادت پر جاری ہوتے ہیں۔

بعض لوگوں نے دین کو صرف نماز روزے کی حد تک محدود سمجھ لیا ہے، اس لئے سیاست و معیشت کے کاروبار کو وہ دین سے بالکل الگ تصور کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سارے معاملات دین کی گرفت سے بالکل آزاد ہیں۔ چنانچہ بہت سے لوگ ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو اپنی نجی زندگی میں نماز روزے اور وظائف و اوراد تک کے پابند ہوتے ہیں، لیکن نہ انہیں خرید و فروخت کے معاملات میں حلال و حرام کی فکر ہوتی ہے، نہ وہ نکاح و طلاق اور برادریوں کے تعلقات میں دین کے احکام کی پرواہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگ انتخابات کو بھی ایک خالص دنیاوی سودا سمجھ کر اس میں مختلف قسم کی بد عنوانیوں کو گوارا کر لیتے ہیں، اور یہ نہیں سمجھتے کہ ان سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہوا ہے، چنانچہ بہت سے لوگ اپنا ووٹ اپنی دیانت دارانہ رائے کے بجائے محض ذاتی تعلقات کی بنیاد پر کسی نااہل کو دے دیتے ہیں، وہ دل میں خوب جانتے ہیں کہ جس شخص کو ووٹ دیا جا رہا ہے وہ اس کا اہل نہیں، یا اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا شخص اس سے

زیادہ حق دار ہے، لیکن صرف دوستی کے تعلق، برادری کے رشتے یا ظاہری لحاظ و مروت سے متاثر ہو کر وہ اپنے ووٹ کا غلط استعمال کر لیتے ہیں، اور انہیں کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ شرعی اور دینی لحاظ سے انہوں نے کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، ووٹ ایک شہادت ہے، اور شہادت کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

و اذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربی

"اور جب کوئی بات کہو تو انصاف کرو، خواہ وہ شخص (جس کے خلاف بات کہی جا رہی ہے،) تمہارا قربت دار ہی کیوں نہ ہو۔"

جب کسی شخص کے بارے میں ضمیر اور دیانت کا فیصلہ یہ ہو کہ وہ ووٹ کا مستحق نہیں ہے. یا کوئی دوسرا شخص اس کے مقابلے میں زیادہ اہلیت رکھتا ہے، تو اس وقت محض ذاتی تعلقات کی بنا پر اسے ووٹ دے دینا "جھوٹی گواہی" کے حکم میں آتا ہے، اور قرآن کریم میں جھوٹی گواہی کی مذمت اتنی شدت کے ساتھ کی گئی ہے کہ اسے بت پرستی کے ساتھ ذکر فرمایا گیا ہے، ارشاد ہے:۔

فاجتنبوا الرجس من الاؑوثان واجتنبوا قول الزور

"پس پرہیز کرو بتوں کی نجاست سے اور پرہیز کرو جھوٹی بات کہنے سے۔"

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر جھوٹی گواہی کو کبیرہ گناہوں میں شمار کر کے اس پر سخت وعیدیں ارشاد فرمائی ہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ: "کیا میں تمہیں اکبر الکبائر (یعنی سب سے بڑے گناہ) نہ بتاؤں؟ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی، اور خوب اچھی طرح سنو! جھوٹی گواہی، جھوٹی بات!" حضرت ابو بکرؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے، جب جھوٹی گواہی کا ذکر آیا تو اٹھ کر بیٹھ گئے، اور "جھوٹی گواہی" کا لفظ بار بار یوں ارشاد فرماتے رہے، یہاں تک کہ ہم دل میں میں کہنے لگے کہ کاش! آپؐ خاموش ہو جائیں۔ (بخاری و مسلم۔ جمع الفوائد ص ۱۶۲ جلد دوم)۔

یہ وعیدیں تو صرف ووٹ کے اس غلط استعمال پر صادق آتی ہین جو محض ذاتی تعلقات کی بنا پر دیا گیا ہو، اور روپے پیسے لے کر کسی نااہل کو ووٹ دینے میں تو دو کبیرہ گناہ جمع ہو جاتے ہیں۔ ایک جھوٹی گواہی، اور دوسرے رشوت خوری۔

لہٰذا ووٹ ڈالنے کے مسئلے کو ہرگز یوں نہ سمجھا جائے کہ یہ ایک خاص دنیوی مسئلہ ہے اور دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یقین رکھئے کہ آخرت میں ایک ایک شخص کو اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے، اور اپنے دوسرے اعمال کے ساتھ اس عمل کا بھی جواب دینا ہے کہ اس نے اپنی "شہادت" کا استعمال کس حد تک دیانت داری کے ساتھ کیا ہے؟۔

بعض حضرات یہ بھی سوچتے ہیں کہ اگر نااہل کو ووٹ دینا گناہ ہے تو ہم کون سے پاکباز ہیں؟ ہم صبح سے شام تک بے شمار گناہوں میں ملوث رہتے ہیں، اگر اپنے گناہوں کی طویل فہرست میں ایک اور گناہ کا اضافہ ہو جائے تو بھی کیا حرج ہے؟

لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ یہ نفس و شیطان کا سب سے بڑا دھوکہ ہے، اول تو انسان اگر ہر گناہ کے ارتکاب کے وقت یہی کچھ سوچا کرے تو وہ کبھی کسی گناہ سے نہیں بچ سکتا، اگر کوئی تھوڑی سی گندگی میں ملوث ہو جائے تو اس کو اس سے پاک ہونے کی فکر کرنی چاہئے، نہ یہ کہ وہ غلاظت کے کسی تالاب میں چھلانگ لگا دے۔

دوسرے، گناہ گناہ کی نوعیتوں میں بڑا فرق ہے۔ جن گناہوں کے نتائج بد پوری قوم کو بھگتنے پڑیں، انکا معاملہ پرائیویٹ گناہوں کے مقابلے میں بہت سخت ہے۔ انفرادی نوعیت کے جرائم، خواہ اپنی ذات میں کتنے ہی گھناؤنے اور شدید ہوں، لیکن ان کے اثرات عموماً دو چار افراد سے آگے نہیں بڑھتے، اس لئے ان کی تلافی بھی عموماً اختیار میں ہوتی ہے، ان سے توبہ و استغفار بھی آسان ہے، اور ان کے معاف ہو جانے کی امید بھی ہر وقت کی جا سکتی ہے۔ اس کے بر خلاف جس گناہ کا برا نتیجہ پورے ملک اور پوری قوم کو بھگتنا ہو اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں۔ یہ تیر کمان سے نکلنے کے بعد واپس نہیں آسکتا۔ اس لئے اگر کسی وقت انسان اس بد عملی سے توبہ کر لے تو کم از کم ماضی کے جرم سے عہدہ بر آ ہونا بہت مشکل ہے، اور اس کے عذاب سے رہائی کی امید بہت کم۔

اس لحاظ سے یہ گناہ چوری، ڈاکے، زناکاری اور دوسرے تمام گناہوں سے شدید تر ہے، اور اسے دوسرے جرائم پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ یہ درست ہے کہ ہم صبح و شام بیسیوں گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر گناہ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق بخشے تو معاف بھی ہوسکتے ہیں، اور ان کی تلافی بھی ممکن ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم اپنی گردن ایک ایسے گناہ میں بھی پھنسالیں جس کی تلافی ناممکن اور جس کی معافی بہت مشکل ہے۔

بعض لوگ یہ بھی سوچتے ہیں کہ لاکھ ووٹوں کے مقابلے میں ایک شخص کے ووٹ کی حیثیت ہی کیا ہے؟ اگر وہ غلط استعمال ہو بھی جائے تو ملک و قوم کے مستقبل پر کیا اثر انداز ہو گا؟

لیکن اول تو ہر شخص ووٹ دیتے وقت یہی سوچنے لگے تو ظاہر ہے کہ پوری آبادی میں کوئی ایک ووٹ بھی صحیح استعمال نہیں ہو سکے گا۔ پھر ووٹوں کی گنتی کا جو نظام ہمارے یہاں رائج ہے اس میں صرف ایک ان پڑھ دیہاتی کا ووٹ بھی ملک و ملت کے لئے فیصلہ کن ہو سکتا ہے۔ اگر ایک بے دین، بد عقیدہ اور بد کردار امیدوار کے بیلٹ بکس میں صرف ایک ووٹ دوسروں سے زیادہ چلا جائے تو وہ کامیاب ہو کر پوری قوم پر مسلط ہو جائے گا۔ اس طرح بعض اوقات صرف ایک جاہل اور ان پڑھ انسان کی معمولی سی غفلت، بھول چوک یا بد دیانتی بھی پورے ملک کو تباہ کر سکتی ہے۔ اس لئے مروجہ نظام میں ایک ایک ووٹ قیمتی ہے اور یہ ہر فرد کا شرعی، اخلاقی، قومی اور ملی فریضہ ہے کہ وہ اپنے ووٹ کو اتنی ہی توجہ اور اہمیت کے ساتھ استعمال کرے جس کا وہ فی الواقعہ مستحق ہے۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ووٹ کس قسم کے افراد کو دیا جائے؟ اس سوال کے جواب میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ ووٹ دیتے وقت امیدوار میں مندرجہ ذیل اوصاف کی تحقیق لازمی ہے:-

(۱) ۔ وہ عقیدے کے اعتبار سے پکا مسلمان ہو۔

(۲) دیندار ہو، یا کم از کم دین، اہل دین، اور شعائر دین کا دل سے احترام کرتا ہو، اور ملک میں اسلامی قوانین نافذ کرنے کا جذبہ رکھتا ہو۔

(۳) دیانت دار ہو، اور ضمیر فروش نہ ہو۔

(۴) نظریہ پاکستان اور اسلامی قومیت کا حامی ہو، اور پاکستان کے وجود و بقا اور اس کے اتحاد کے مسئلے پر کوئی سمجھوتہ نہ کر سکتا ہو۔

(۵) شریف اور بااخلاق ہو، اور ملک و قوم کی واقعی خدمت کرنا چاہتا ہو۔

(۶) کھلے عام فسق و فجور یا محرمات شرعیہ میں مبتلا نہ ہو۔

(۷) سلیم الفکر ہو اور نظام حکومت کے مسائل کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔

آپ کے حلقہ انتخاب میں جو شخص بھی اس معیار پر پورا اترتا ہو یا اس سے قریب ہو، اسے ووٹ دے کر کامیاب بنانے کی کوشش کیجئے؟ خواہ وہ کسی جماعت یا کسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہو، اور اگر امیدواروں میں سے کوئی بھی اس معیار پر پورا نہیں اترتا، تو اس شخص کو ووٹ دیجئے

جو ان اوصاف سے سب سے زیادہ قریب ہو، اور اس کا شر دوسروں کے مقابلے میں کم ہو؟

اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے کہ اس معیار پر کون پورا اترتا ہے؟ امیدواروں کے حالات کی تحقیق ہر ووٹر کا فریضہ ہے، عام زندگی میں اس کا کردار، اس کا سیاسی اور معاشرتی ماضی، اس کے عقائد و افکار، اس کی دلچسپیاں اس کے احباب اور خصوصی تعلق رکھنے والے، ان تمام باتوں کی تحقیق کر کے صحیح نتیجے تک پہنچنا انشاء اللہ مشکل نہیں ہوگا، اس کے علاوہ اس بارے میں اہل فکر سے مشورہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ جل شانہ سے ہی ہدایت طلب کی جائے، جس کا بہترین طریقہ نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے استخارے کی صورت میں بتلایا ہے۔ ووٹ دینے سے پہلے کسی دن دو رکعت نماز استخارہ کی نیت سے پڑھئے اور اس کے بعد استخارہ کی مشہور دعا مانگئے، دعا کے الفاظ مستحضر نہ ہوں تو اپنی ہی زبان میں اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ووٹ کی امانت کو اس کے صحیح مصرف میں خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ تحقیق، مشورہ، اور استخارہ یہ تین کام ایسے ہیں جو آپ کو ووٹ کی عظیم ذمہ داری سے سبکدوش کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد جو ووٹ آپ نیک نیتی سے دیں گے، انشاء اللہ وہ ملک و ملت کے لئے صلاح و فلاح کا موجب ہوگا، اور کم از کم آپ آخرت کی جوابدہی سے سبکدوش ہوجائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

محمد تقی عثمانی

۹۷/۶/۵ء

وما علینا الا البلاغ

ووٹ کی اسلامی حیثیت

پاکستان کی تیئیس سالہ تاریخ میں عوام کو ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ انہیں اپنی مرضی سے اپنی حکومت منتخب کرنے کا اختیار نہیں ملا۔ یہ شکایت بلاشبہ بجا اور برحق تھی یہ واقعہ ہے کہ بناء پاکستان سے لے کر اب تک انہیں غیر جانب دارانہ عام انتخابات کی سہولت میسر نہیں آسکی۔ دسمبر ۱۹۷۰ء کے مجوزہ انتخابات کے ذریعہ انہیں پہلی بار یہ موقعہ مل رہا ہے، ابھی تک الیکشن کے انتظامات میں جانب داری کا کوئی پہلو سامنے نہیں آیا۔ لہٰذا جہاں تک ہمارا اندازہ ہے انشاء اللہ یہ انتخابات انتظامیہ کی سمت سے منصفانہ اور غیر جانب دارانہ ہی ہوں گے۔
ان حالات میں پورے ملک کی ذمہ داری عوام پر آپڑی ہے، اب اگر خدانخواستہ غلط اور نااہل قسم کے لوگ برسراقتدار آئے تو اس کی پوری ذمہ داری عوام پر ہوگی، اور اس موقعہ کے بعد حکام کا تمام تر عذاب و ثواب ان لوگوں کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا جو حکام کو منتخب کر کے انہیں اقتدار تک پہنچائیں گے۔

حکومت پر تنقید ہر مہذب ملک میں عوام کا ناگزیر حق سمجھا جاتا ہے جو بہرقیمت باشندوں کو ملنا چاہئے، اس حق کی ضرورت و افادیت ناقابل انکار ہے، لیکن ہم نے ماضی میں اس حق کا غلط استعمال بھی کیا ہے ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اس حق کے استعمال کے بہانے خود اپنی بہت سی کمزوریوں کو چھپانے کی کوشش کی ہے، اور اس پہلو سے بہت کم غور کیا ہے کہ ہمارے حکام بھی درحقیقت خود ہمارے کردار و عمل کا آئینہ ہوتے ہیں، سابق صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب کا دور حکومت اپنی آمریت اور عوام کی حق تلفی کے لئے آج بہت بدنام ہے، اور کوئی شک نہیں کہ اس کی بدعنوانیاں اسی لائق تھیں، لیکن اس دور کی بہت سی خرابیوں کی ذمہ داری خود ہم پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اگر ہم میں خوف، طمع اور ذاتی مفاد پرستی کے

جذبات نہ ہوتے تو نہ یہ آمریت ہم پر دس سال تک مسلط رہ سکتی تھی اور نہ اپنے اقتدار کے سائے میں وہ گل کھلا سکتی تھی جنھوں نے ملک کو مادی اور اخلاقی تباہی کے کنارے پہنچا کر چھوڑا۔

■ بلاشبہ قابل صد نفرین و ملامت ہیں جو اپنی دولت کے سہارے ووٹ خرید خرید کر اقتدار تک پہنچتے ہیں، لیکن ان کے جرم میں وہ عوام بھی برابر کے شریک ہیں جو کھنکتے ہوئے سکوں کی آواز سن کر قوم، ملک، دین اور اخلاق سب کو بھول جاتے ہیں۔ اور پھر جب ان کے ووٹوں کے خریدار اقتدار کی کرسی پر بیٹھ کر سارے عوام کا خون نچوڑتے ہیں تو یہ اپنے گریبان میں منہ ڈالنے کے بجائے حکومت پر تنقید کے بہانے دولت کے کسی نئے سورج کی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔

اب تک تو یہ خیر کہنے کی گنجائش بھی تھی کہ تیئس سال کی مدت میں ایسے انتخابات ہوئے ہی نہیں جن میں ملک کے تمام بالغ باشندوں کو اپنی رائے کے استعمال کرنے کا موقع ملا ہو، لیکن اگر دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات ٹھیک ٹھیک منعقد ہو گئے تو یہ کہنے کا بھی کوئی حق عوام کو نہیں رہے گا، اور اب جو حکومت بھی آئے گی اس کے تمام اعمال و افعال بجا طور پر خود ان ہی کی طرف منسوب ہوں گے، اور اب اگر حکومت نے لادینیت کو فروغ دیا، اسلام پر عمل جراحی کی، غریب عوام کے حقوق تلف کئے اور ملک و ملت کا خون نچوڑا تو کم از کم باہر کی دنیا میں یہی سمجھا جائے گا کہ اس قوم کی اکثریت یہی کچھ چاہتی ہے، اور (خاکم بدہن) یہ پوری قوم ہی اخلاق باختہ اور قومی و اجتماعی غیرت و حمیت سے خالی ہے۔

دوسری طرف اگر عوام نے اس مرحلے پر اپنی ذمہ داری کا خاطر خواہ احساس کیا، اور خوف و طمع کے محرکات کو قدموں تلے کچل کر پوری دیانت داری اور اجتماعی شعور کے ساتھ اپنے ووٹ کا استعمال کیا تو آنے والی حکومت گزشتہ تیئس سال کے نقصانات کی تلافی کر کے رفتہ رفتہ ماضی کے سارے داغ دھو سکتی ہے، اور اس صورت میں پوری دنیا پر یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ یہ قوم آزادی کی قدر پہچانتی ہے اور اس کا صحیح استعمال جانتی ہے۔

جب تک ہم پوری دنیا پر اپنے عمل سے یہ باور نہیں کرائیں گے کہ ہم ایک مکمل دین اور مستحکم نظام حیات رکھتے ہیں، اور دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اپنے اس دین سے پھیر نہیں سکتی، اس وقت تک ہمارا ملک بیرونی سازشوں کی آماجگاہ بنا رہے گا، دنیا کی تمام طاقت ور قومیں ہمیں ایک بکاؤ مال سمجھ کر ہمارے قومی تشخص، عزت اور آزادی کا نیلام کرتی رہیں گی، لیکن اگر ایک مرتبہ

ہم نے اپنے عمل سے دنیا کو یہ بتا دیا کہ کسی دنیوی مصیبت کا خوف یا کسی دنیوی آسائش کا لالچ ہمیں اپنے ضمیر کے خلاف زبان قلم یا قدم اٹھانے پر آمادہ نہیں کر سکتا تو یہ خارجی طاقتیں سازشوں کے جال ہزار بن لیں، اللہ کی نصرت سے ہم پر کبھی اپنا تسلط قائم نہیں کر سکیں گی۔

اس لحاظ سے آئندہ ماہ ہونے والے انتخابات عوام کے ہاتھ میں دو دھاری تلوار بن کر آرہے ہیں، اگر ہم چاہیں تو اس سے اپنے دشمنوں کا خاتمہ کر کے امن و سکون حاصل کر سکتے ہیں، اور چاہیں تو اسی تلوار کو خود اپنے گلے پر چلا کر خود اپنا کام بھی تمام کر سکتے ہیں۔

ماضی کی گندی سیاست نے الیکشن اور ووٹ کے لفظوں کو اتنا بدنام کر دیا ہے کہ ان کے ساتھ مکروفریب، جھوٹ، رشوت اور دغابازی کا تصور لازم ذات ہو کر رہ گیا ہے، اسی لئے اکثر شریف لوگ اس جھنجھٹ میں پڑنے کو مناسب ہی نہیں سمجھتے، اور یہ غلط فہمی تو بے حد عام ہے کہ الیکشن اور ووٹوں کی سیاست کا دین و مذہب سے کوئی واسطہ نہیں، اس سلسلے میں ہمارے معاشرے کے اندر چند در چند غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں، یہاں ان کا ازالہ بھی ضروری ہے۔

پہلی غلط فہمی تو سیدھے سادے لوگوں میں اپنی طبعی شرافت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، اس کا منشاء اتنا برا نہیں، لیکن نتائج بہت برے ہیں، وہ غلط فہمی یہ ہے کہ آج کی سیاست مکر و فریب کا دوسرا نام بن چکی ہے، اس لئے شریف آدمیوں کو نہ سیاست میں کوئی حصہ لینا چاہئے، نہ الیکشن میں کھڑا ہونا چاہئے اور نہ ووٹ ڈالنے کے خرخشے میں پڑنا چاہئے۔

یہ غلط فہمی خواہ کتنی نیک نیتی کے ساتھ پیدا ہوئی ہو، لیکن بہرحال غلط اور ملک و ملت کے لئے سخت مضر ہے، ماضی میں ہماری سیاست بلاشبہ مفاد پرست لوگوں کے ہاتھوں گندگی کا ایک تالاب بن چکی ہے، لیکن جب تک کچھ صاف ستھرے لوگ اسے پاک کرنے کے لئے آگے نہیں بڑھیں گے۔ اس گندگی میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا اور پھر ایک نہ ایک دن یہ نجاست خود ان کے گھروں تک پہنچ کر رہے گی۔ لہٰذا عقلمندی اور شرافت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ سیاست کی اس گندگی کو دور دور سے برا کہا جاتا ہے، عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ سیاست کے میدان کو ان لوگوں کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کی جائے جو مسلسل اسے گندا کر رہے ہیں۔

پھر آئندہ ماہ کے انتخابات محض چند انتظامی نوعیت کی تبدیلیوں کے لئے منعقد نہیں ہو رہے ہیں، یہ پورے ملک کی زندگی کا ایک انقلابی موڑ ہے جس میں ملک و ملت کی قسمت کا فیصلہ ہونا ہے، ان انتخابات میں دو مختلف نظریئے اور دو متحارب نظام زندگی ٹکرائیں گے، ایک کا کہنا یہ ہے کہ پاکستان محض ایک معاشی ضرورت کے تحت بنا تھا۔ اس کا کوئی مستقل نظریہ نہیں ہے، اس کائنات پر حکومت انسانی خواہشات کی ہے، وہی اچھے برے کا فیصلہ کرے گی، اور وقت کے لحاظ سے زندگی کا جو دستور بھی سمجھ میں آجائے گا، اسی کے مطابق زندگی کو ڈھال لیا جائے گا، اور دوسرے کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کائنات پر حاکمیت صرف اللہ کی ہے۔ اچھے برے کا فیصلہ کرنے والا وہی ہے، پاکستان اسی کے نام پر بنا تھا، یہاں اسی کا قانون چلے گا اسی کی بات مانی جائے گی، اور سیاست و معیشت سے لے کر پرائیویٹ زندگی تک ہر معاملے میں اسی کے احکام واجب الاطاعت ہوں گے۔

ان حالات میں جب کہ لڑائی اسلام اور لادینیت کی اور پاکستان کے بقاء و فنا کی ہے، کسی بھی باشعور شخص کے لئے غیر جانب دار رہنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، اس وقت ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنی ساری توانائیاں اسلامی قوتوں کو مدد پہنچانے میں صرف کرے، اس موقع پر خاموش بیٹھنا بھی ایسا ہی جرم ہے جیسا دشمن کو تقویت پہنچانا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الناس اذا راوا الظالم فلم یاخذوا علی یدیہ اوشک ان یعمھم اللہ بعقاب (جمع الفوائد ص: ۵۱ ج۲ بحوالہ ابوداود و ترمذی)

اگر لوگ ظالم کو دیکھ کر اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنا عذاب عام نازل فرمائیں۔

اگر آپ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ظلم ہو رہا ہے، اور انتخابات میں سرگرم حصہ لے کر اس ظلم کو کسی نہ کسی درجے میں مٹانا آپ کی قدرت میں ہے تو اس حدیث کی رو سے یہ آپ کا فرض ہے کہ خاموش بیٹھنے کے بجائے ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اس ظلم کو روکنے کی مقدور بھر کوشش کریں۔

بہت سے دین دار لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اپنا ووٹ استعمال نہیں کریں گے تو اس سے کیا نقصان ہو گا؟ لیکن سنئے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے مسند احمد میں روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

من اذل عنده مومن فلم ينصره وهو يقدر على أن ينصره أذله الله على رؤس الخلائق (ايضا ص ٥١، ج٢)

جس شخص کے سامنے کسی مومن کو ذلیل کیا جا رہا ہو اور وہ اس کی نصرت کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود اس کی مدد نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے بر سر عام رسوا کرے گا۔

شرعی نقطہ نظر سے ووٹ کی حیثیت "شہادت" (گواہی) کی سی ہے، اور جس طرح جھوٹی گواہی دینا حرام اور ناجائز ہے۔ اسی طرح ضرورت کے موقع پر شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

ولا تكتمو الشهادة و من يكتمها فانه أثم قلبه

اور تم ـــــــ گواہی کو نہ چھپاؤ، اور جو شخص اس گواہی کو چھپائے، اس کا دل گناہ گار ہے۔

اور جو حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

من كتم شهادة اذا دعى اليها كان كمن شهد بالزور.

(جمع الفوائد بحواله طبرانی ص ٦٢ ج ١)

جس کسی کو شہادت کے لئے بلایا جائے، پھر وہ اسے چھپائے تو وہ ایسا ہے جیسے جھوٹی گواہی دینے والا۔

بلکہ گواہی دینے کے لئے تو اسلام نے اس بات کو پسند کیا ہے کہ کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی انسان اپنا یہ فریضہ ادا کر دے، اور اس میں کسی کی دعوت یا ترغیب کا انتظار بھی نہ کرے، حضرت زید بن خالدؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

ألا اخبركم بخير الشهداء الذى ياتى بشهادته قبل ان

يسألها. (ايضا ص: ٢٦١ ج ١ بحواله مالك و مسلم وغيره)

کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ بہترین گواہ کون ہے؟ وہ شخص جو اپنی گواہی کسی کے مطالبہ کرنے سے پہلے ہی ادا کر دے۔

ووٹ بلاشبہ ایک شہادت ہے، قرآن و سنت کے یہ تمام احکام اس پر بھی جاری ہوتے ہیں، لہٰذا ووٹ کو محفوظ رکھنا دینداری کا تقاضا نہیں، اس کا زیادہ سے زیادہ صحیح استعمال کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ یوں بھی سوچنے کی بات ہے کہ اگر شریف، دین دار اور معتدل مزاج کے لوگ انتخابات کے تمام معاملات سے بالکل یکسو ہو کر بیٹھ جائیں تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ یہ پورا میدان، شریروں، فتنہ پردازوں اور بے دین افراد کے ہاتھوں میں سونپ رہے ہیں، ایسی صورت میں کبھی بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ حکومت نیک اور اہلیت رکھنے والے افراد کے ہاتھ میں آئے، اگر دین دار لوگ سیاست سے اتنے بے تعلق ہو کر رہ جائیں تو پھر انہیں ملک کی دینی اور اخلاقی تباہی کا شکوہ کرنے کا بھی کوئی حق نہیں پہنچتا، کیوں کہ اس کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے اور ان کے حکام کا سارا عذاب و ثواب ان ہی کی گردن پر ہو گا اور خود ان کی آنے والی نسلیں اس شر و فساد سے کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکیں گی جس پر بند باندھنے کی انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔

انتخابات کے سلسلے میں ایک دوسری غلط فہمی پہلی سے زیادہ سنگین ہے، چونکہ دین کو لوگوں نے صرف نماز روزے کی حد تک محدود سمجھ لیا ہے، اس لئے سیاست و معیشت کے کاروبار کو وہ دین سے بالکل الگ تصور کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سارے معاملات دین کی گرفت سے بالکل آزاد ہیں۔ چنانچہ بہت سے لوگ ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو اپنی نجی زندگی میں نماز روزے کے اور وظائف و اوراد تک کے پابند ہوتے ہیں، لیکن نہ انہیں خرید و فروخت کے معاملات میں حلال و حرام کی فکر ہوتی ہے، نہ وہ نکاح و طلاق اور برادریوں کے تعلقات میں دین کے احکام کی کوئی پروا کرتے ہیں۔

ایسے لوگ انتخابات کو بھی ایک خالص دنیاوی سودا سمجھ کر اس میں مختلف قسم کی بدعنوانیوں کو گوارا کر لیتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ ان سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہوا ہے، چنانچہ بہت سے لوگ

اپنا ووٹ اپنی دیانتدارانہ رائے کے بجائے محض ذاتی تعلقات کی بنیاد پر کسی نااہل کو دے دیتے ہیں، وہ دل میں خوب جانتے ہیں کہ جس شخص کو ووٹ دیا جارہا ہے وہ اس کا اہل نہیں، یا اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا شخص اس کا زیادہ حق دار ہے لیکن صرف دوستی کے تعلق، برادری کے رشتے، یا ظاہری لحاظ و مروت سے متاثر ہو کر وہ اپنے ووٹ کو غلط جگہ استعمال کر لیتے ہیں اور کبھی خیال میں بھی نہیں آتا کہ شرعی و دینی لحاظ سے انہوں نے کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے، ووٹ ایک "شہادت" ہے اور شہادت کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد یہ ہے:۔

«واذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربی»

اور جب کوئی بات کہو تو انصاف کرو خواہ وہ شخص (جس کے خلاف بات کہی جارہی ہے) تمہارا قرابت دار ہی کیوں نہ ہو۔

جب کسی شخص کے بارے میں، ضمیر اور دیانت کا فیصلہ یہ ہو کہ وہ ووٹ کا مستحق نہیں ہے، یا کوئی دوسرا شخص اس کے مقابلے میں زیادہ اہلیت رکھتا ہے، تو اس وقت محض ذاتی تعلقات کی بناء پر اسے ووٹ دے دینا "جھوٹی گواہی" کے ذیل میں آتا ہے اور قرآن کریم میں جھوٹی گواہی کی مذمت اتنی شدت کے ساتھ کی گئی ہے کہ اسے بت پرستی کے ساتھ ذکر فرمایا گیا ہے، ارشاد ہے:۔

«فاجتنبوا الرجس من الاوثان و اجتنبوا قول الزور»

پس تم پرہیز کرو بتوں کی نجاست سے اور پرہیز کرو جھوٹی بات کہنے سے۔

اور حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر جھوٹی گواہی کو اکبر الکبائر میں شمار کر کے اس پر سخت وعیدیں ارشاد فرمائی ہیں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "کیا میں اکبر الکبائر (بڑے بڑے گناہ) نہ بتاؤں ــــ؟ (۱) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی اور خوب اچھی طرح سنو! جھوٹی گواہی، جھوٹی بات!" حضرت ابو بکرؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے، جب جھوٹی گواہی کا ذکر آیا تو اٹھ کر بیٹھ گئے، اور "جھوٹی گواہی" کا لفظ بار بار ارشاد فرماتے رہے، یہاں تک کہ ہم دل میں کہنے لگے کہ کاش! آپ خاموش ہو جائیں۔ (بخاری و مسلم، جمع الفوائد ص ۱۶۲، ج ۲)

یہ وعیدیں تو صرف ووٹ کے اس غلط استعمال پر صادق آتی ہیں جو محض ذاتی تعلقات کی بناء پر دیا گیا ہو، اور روپے پیسے لے کر کسی نااہل کو ووٹ دینے میں جھوٹی گواہی کے علاوہ رشوت کا عظیم گناہ بھی ہے۔

لہٰذا ووٹ ڈالنے کے مسئلہ کو ہرگز یوں نہ سمجھا جائے کہ یہ ایک خالص دنیوی مسئلہ ہے، اور دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں، یقین رکھئے کہ آخرت میں ایک ایک شخص کو اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے، اور اپنے دوسرے اعمال کے ساتھ اس عمل کا بھی جواب دینا ہے کہ اس نے اپنی "شہادت" کا استعمال کس حد تک دیانت داری کے ساتھ کیا ہے۔

بعض حضرات یہ بھی سوچتے ہیں کہ اگر نااہل کو ووٹ دینا گناہ ہے تو ہم کون سے پاکباز ہیں؟ ہم صبح سے لے کر شام تک بے شمار گناہوں میں ملوث رہتے ہیں، اگر اپنے گناہوں کی طویل فہرست میں ایک اور گناہ کا اضافہ ہو جائے تو بھی کیا حرج ہے؟

لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ یہ نفس و شیطان کا سب سے بڑا دھوکہ ہے، اول تو انسان اگر ہر گناہ کے ارتکاب کے وقت یہی کچھ سوچا کرے تو وہ کبھی کسی گناہ سے نہیں بچ سکتا، اگر کوئی شخص تھوڑی سی گندگی میں ملوث ہو جائے تو اس کو اس سے پاک ہونے کی فکر کرنی چاہئے نہ یہ کہ وہ غلاظت کے کسی تالاب میں چھلانگ لگا دے۔

دوسرے گناہ گناہ کی نوعیتوں میں بھی بڑا فرق ہے جن گناہوں کے نتائج بد پوری قوم کو بھگتنے پڑیں، ان کا معاملہ پرائیوٹ گناہوں کے مقابلے میں بہت سخت ہے، انفرادی نوعیت کے جرائم، خواہ اپنی ذات میں کتنے ہی گھناؤنے اور شدید ہوں، لیکن ان کے اثرات دو چار افراد سے آگے نہیں بڑھتے، اس لئے ان کی تلافی بھی عموماً اختیار میں ہوتی ہے، ان سے توبہ و استغفار کر لینا بھی آسان ہے، اور ان کے معاف ہو جانے کی امید بھی ہر وقت کی جا سکتی ہے، اس کے برخلاف جس گناہ کا برا نتیجہ پورے ملک اور پوری قوم نے بھگتنا ہو، اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں، یہ تیر کمان سے نکلنے کے بعد واپس نہیں آسکتا، اس لئے اگر کسی وقت انسان اس بدعملی سے آئندہ کے لئے توبہ کر لے تو کم از کم ماضی کے جرم سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل ہے، اور اس کے عذاب سے رہائی کی امید بہت کم"۔

اس حیثیت سے یہ گناہ چوری، ڈاکہ، زناکاری اور دوسرے تمام گناہوں سے شدید تر ہے، اور اسے دوسرے جرائم پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

یہ درست ہے کہ ہم صبح و شام بیسیوں گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں، لیکن یہ سب گناہ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی وقت توبہ کی توفیق بخشے تو معاف بھی ہو سکتے ہیں اور ان کی تلافی بھی کی جا سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم اپنی گردن ایک ایسے گناہ میں بھی پھنسا لیں جس کی تلافی ناممکن اور جس کی معافی بہت مشکل ہے۔

"بعض لوگ یہ بھی سوچتے ہیں کہ لاکھوں ووٹوں کے مقابلے میں ایک شخص کے ووٹ کی کیا حیثیت ہے؟ اگر وہ غلط استعمال بھی ہو جائے تو ملک و قوم کے مستقبل پر کیا اثرانداز ہو سکتا ہے؟

لیکن اول تو اگر ہر شخص ووٹ ڈالتے وقت یہی سوچنے لگے تو ظاہر ہے کہ پوری آبادی میں کوئی ایک ووٹ بھی صحیح استعمال نہیں ہو سکے گا۔ پھر ووٹوں کی گنتی کا جو نظام ہمارے یہاں رائج ہے اس میں صرف ایک ان پڑھ جاہل شخص کا ووٹ بھی ملک و ملت کے لئے فیصلہ کن ہو سکتا ہے، اگر ایک بے دین، بدعقیدہ اور بدکردار کے بیلٹ بکس میں صرف ایک ووٹ دوسروں سے زیادہ چلا جائے تو وہ کامیاب ہو کر پوری قوم پر مسلط ہو جائے گا۔ اس طرح بعض اوقات صرف ایک جاہل اور ان پڑھ انسان کی معمولی غفلت، بھول چوک یا بددیانتی بھی پورے ملک کو تباہ کر سکتی ہے اس لئے مروجہ نظام میں ایک ایک ووٹ قیمتی ہے اور یہ ہر فرد کا شرعی، اخلاقی، قومی اور ملی فریضہ ہے کہ وہ اپنے ووٹ کو اتنی ہی توجہ اور اہمیت کے ساتھ استعمال کرے جس کا وہ فی الواقعہ مستحق ہے۔

محمد تقی عثمانی

انتخابی بحران

جمہوری ملکوں میں انتخابات کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عوام ان کے ذریعے اپنی پسند کے نمائندے منتخب کر کے ایک ایسی حکومت بنا سکیں جو عوام کی اکثریت کی مرضی کے مطابق ہو، چنانچہ قاعدے کا تقاضا یہ ہے کہ انتخابات ملک کے لئے نئی امنگوں کا باعث ہوں، لیکن ہماری شامت اعمال یہ ہے کہ ہمارے ملک میں انتخابات نئے اندیشے اور نئی بے چینیاں لے کر نمودار ہوتے ہیں، اور اس سے قوم عرصہ دراز تک سنبھل نہیں پاتی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نتیجے میں جو حالات پیش آئے انہوں نے ملک کا ایک بازو کاٹ ڈالا، اور اب ۷۷ء میں جو انتخابات منعقد ہوئے ہیں انہوں نے ملک کو ایک سنگین سیاسی بحران سے دوچار کر دیا ہے۔ انتخابات کے جو نتائج منظر عام پر آئے ہیں ان کے مطابق بر سر اقتدار جماعت نے دوبارہ اسمبلی میں بھاری اکثریت حاصل کر لی ہے جبکہ مخالف جماعتوں نے پورے ایوان میں کل ۳۷ نشستیں حاصل کی ہیں۔ بر سر اقتدار جماعت ان نتائج کو مجموعی اعتبار سے درست قرار دے کر اس بات پر مطمئن ہے کہ قوم نے اسے دوبارہ پانچ سال تک حکومت کرنے کا اختیار دے دیا ہے، اور مخالف جماعتوں کے نزدیک یہ انتخابات سراسر دھندلی پر مبنی ہونے کی وجہ سے محض ایک ڈھونگ کی حیثیت رکھتے ہیں، لہٰذا ان کا مطالبہ ہے کہ الیکشن نئے قابل اعتماد انتظامات کے ساتھ از سر نو منعقد ہونا چاہئے اور اس غرض کے لئے انہوں نے ایک ملک گیر تحریک شروع کی ہوئی ہے۔ اس شدید تناؤ کے نتیجے میں پورا ملک نہایت افسردگی، بے چینی اور تشویش و اضطراب کا شکار ہے، اور بجائے اس کے کہ انتخابات کے بعد عوام میں نئی زندگی اور نیا ولولہ پیدا ہوتا دلوں پر ایک عجیب قسم کی پژمردگی اور وحشت طاری ہو گئی ہے۔

ہم بار بار اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ ہمیں سیاسی معاملات میں نہ بصیرت حاصل ہے اور نہ ہم نے عملی سیاست (بالخصوص انتخابی سیاست) میں کبھی حصہ لیا ہے، لہٰذا اس مسئلے میں کوئی ذمہ دارانہ محاکمہ کرنا ہمارا منصب نہیں، اور نہ ہمارا محاکمہ اس معاملے میں وزنی اور موثر ہوسکتا ہے، ہم تو یہ دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ملک کو اس بحران سے امن و سکون کے ساتھ نکال دے اور اس ملک کی باگ ڈور ایسے افراد کو عطا فرمائے جو اس کے واقعی مستحق ہوں، اور پھر انہیں ملک و ملت کی ایسی خدمت کی توفیق عطا فرمائے جو مسلمانوں کی صلاح و فلاح کی موجب ہو۔ آمین۔

البتہ دین کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے ایک ایک بات جو ان دنوں بار بار دل میں ابھرتی رہی، وہ اپنے قارئین تک پہنچانے کو ضرور دل چاہتا ہے۔

یہ قرآنی حقیقت تو ناقابل انکار ہے کہ ہمیں اس دنیا میں جو تکلیف یا مصیبت پیش آتی ہے، خواہ انفرادی نوعیت کی ہو یا اجتماعی نوعیت کی، وہ ہماری اپنی بد اعمالیوں کا نتیجہ ہوتی ہے، قرآن کریم میں ارشاد ہے:۔

ما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم و یعفو عن کثیر

"تمہیں جو کوئی مصیبت پہنچتی ہے، وہ تمہارے اپنے اعمال کی بنا پر پہنچتی ہے، اور اللہ تعالیٰ بہت سے اعمال سے تو در گزر فرمادیتا ہے۔"

ہماری سیاسی زندگی میں وقفوں وقفوں سے جو بحران پیدا ہوتے ہیں اور ان کی بناء پر پوری ملت کو جن مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ بھی قرآنی کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ یہ بات متعین اور یقینی طور سے کہنا تو بے شک مشکل ہے کہ ہمارا یہ حالیہ بحران ہماری کونسی بد عملی کا نتیجہ ہے، لیکن ہمارا ایک اجتماعی جرم ایسا ہے جو خاص طور سے انتخابات کے موقع پر اور زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے، اور وہ یہ کہ ہم سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے ہر وہ طریقہ اختیار کرنا درست سمجھتے ہیں جو ان مقاصد میں معاون ہو سکتا ہو، اور اس معاملے میں جائز و ناجائز، حلال و حرام، اخلاقی اور غیر اخلاقی کی تمیز باقی نہیں رکھتے، اسی طرح کسی کی موافقت یا مخالفت کرتے ہوئے ہم عموماً حدود پر قائم نہیں رہتے۔ بلکہ بسا اوقات معقولیت اور دیانت کی تمام حدیں پھلانگ جاتے ہیں۔ ہمارا یہ جرم ایسا ہے جس میں ہم سب مبتلا ہیں، اور اس میں کوئی استثناء مشکل سے ہی ملے گا۔

ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی شخص انتخابات میں امیدوار بن کر کھڑا ہوتا ہے تو اس کے پیش نظر

بس یہ مقصد ہوتا ہے کہ مجھے ہر قیمت پر یہ انتخاب جیتنا ہے، چنانچہ اس غرض کے لئے "انا ولا غیری" کے نعرے لگانا، دوسروں پر طرح طرح کے اتہامات عائد کرنا، دوسروں کا تمسخر و استہزاء کرنا، غیبت اور دروغ بیانی، لڑائی جھگڑے، دشنام طرازیاں، دھاندلی اور مکر و فریب، سب کچھ جائز سمجھ لیا جاتا ہے، دوسری طرف جو لوگ کسی امیدوار کی حمایت یا مخالفت کرتے ہیں وہ اپنے امیدوار کو سراپا سفید اور اپنے مخالف کو سراپا سیاہ ثابت کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں، جس شخص یا جماعت کی حمایت کی جارہی ہے اس کے اوصاف بڑھا چڑھا کر بیان کئے جارہے ہیں، اس کی تعریفوں کے پل باندھے جارہے ہیں، اس کی ہر غلطی کی جا و بے جا تاویلات کی جاتی ہیں اور یہ باور کرایا جاتا ہے کہ وہ اگر معصوم نہیں تو منزہ عن الخطا ضرور ہے، دوسری طرف جس فرد یا جماعت کی مخالفت کی جاتی ہے اس میں کیڑے ہی کیڑے نکالنے کا کام شروع ہو جاتا ہے، اس کو سر سے لے کر پاؤں تک عیبوں ہی عیبوں کا مجموعہ ثابت کیا جاتا ہے، اس کی کسی اچھائی کا اعتراف ممکن نہیں رہتا، یہاں تک بسا اوقات اس کی صحیح بات کو بھی غلط معنی پہنائے جاتے ہیں، اور اس کی غیبت کرنے اس پر بہتان باندھنے، اس کا تمسخر اڑانے اور اسے ذلیل و رسوا کرنے کے ہر طریقے کو شیر مادر سمجھ لیا جاتا ہے، اور دشنام طرازی و بد گوئی کا تو وہ طوفان برپا ہوتا ہے۔ کہ الامان پھر ایک شخص جب تک سیاسی اعتبار سے اپنا حلیف رہتا ہے اس وقت تک تو اس کو تمام خوبیوں کا پیکر قرار دیا جاتا ہے، اور جب سیاسی انقلابات کے تحت وہ دوسرے کیمپ میں شامل ہو جائے تو اسی میں تمام خرابیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ اور اس کے برعکس اپنا کوئی سیاسی حریف جس میں پہلے دنیا بھر کے عیوب جمع تھے۔ اپنے کیمپ میں شامل ہو جائے تو اس کے تمام عیوب ختم ہو جاتے ہیں، اور اس کی ہر بات قابل تائید بن جاتی ہے۔

پچھلے دو مہینے ہمارے ملک میں جو انتخابی مہم جاری رہی افسوس کہ وہ اس قسم کے واقعات سے پر ہے، صرف جلسوں ہی میں نہیں، بلکہ نجی مجلسوں میں بھی دل کھول کر ان برائیوں کا ارتکاب کیا گیا ہے اور شاید ہم میں سے کوئی فرد ایسا نہ ہو جس کا دامن ان باتوں سے بالکل پاک رہا ہو اور بار بار دل میں یہ خیال ابھرتا ہے کہ اس وقت ہمارا ملک جس سنگین بحران سے دو چار ہے، وہ شاید ہماری انہی بد اعمالیوں کی سزا ہو اللہ تعالیٰ ہمیں ان گناہوں پر توبہ کی توفیق عطا فرمائے، اور ہمیں توفیق بخشے کہ ہم اپنی آئندہ سیاسی زندگی کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ان گندگیوں سے پاک کر سکیں۔

سیاست اسلام میں کوئی شجرہ ممنوعہ نہیں ہے، بلکہ دین ہی کا ایک شعبہ ہے، لیکن ہم مسلمانوں کو یہ بات کسی وقت فراموش نہ کرنی چاہئے کہ ہماری سیاست غیر مسلموں کی سیاست

سے بالکل مختلف ہونی چاہئے، اسلام میں گوئبلز اور میکیاؤلی کی سیاست کی کوئی گنجائش نہیں جس میں جھوٹ اور مکر و فریب کی کھلی چھوٹ ہوتی ہے۔ البلاغ کے ان صفحات میں ہم بار بار اس خیال کا اظہار کر چکے ہیں کہ ہماری رائے میں مسلمانوں کے سیاسی زوال اور ناکامیوں کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہم نے اپنی سیاست کو بھی انہی طریقوں پر چلانے کی کوشش کی ہے جو در حقیقت غیر مسلموں کے طریقے تھے، اور اس معاملے میں اسلامی تعلیمات و آداب کو پس پشت ڈال دیا ہے، غیر مسلم قومیں خدا کی نافرمانی کر کے بھی شاید دنیوی عیش و آرام حاصل کر سکتی ہوں، لیکن مسلمان قوم جس کا خمیر ہی لاالٰہ الا اللہ سے اٹھا ہے اس کو احکام خداوندی سے منہ موڑنے کے بعد دنیا میں بھی مصائب و آلام کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آسکتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حقیقت کا صحیح فہم اور اس پر عمل کی پوری توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

محمد تقی عثمانی

یکم ربیع الثانی ۹۷ھ

ہماری دینی سیاسی جماعتیں

ہم بار بار وضاحت کر چکے ہیں کہ بری سیاست کبھی ہماری دلچسپی کا موضوع نہیں رہی، ہمیں اگر تعلق خاطر ہے تو صرف اس سیاست سے جو خالص اسلام کے لئے ہو۔ لہٰذا وہ جماعتیں ہماری گفتگو سے خارج ہیں جو سیاست برائے سیاست کے اصول پر میدان میں اتری ہیں۔ ہمیں صرف ان جماعتوں کے کام پر نظر ڈالنی ہے جنہوں نے میدان سیاست کو صرف دین کا جھنڈا گاڑنے کے لئے منتخب کیا ہے۔

ایسی جماعتیں ہمارے ملک میں ایک سے زیادہ ہیں، اور ان کا وجود، اس لحاظ سے ملک کی خوش قسمتی ہے کہ ان ہی کے طفیل سیاست کے موجودہ ماحول میں دین حق کا کلمہ بلند رہا ہے، ورنہ ایسے ملک بھی دنیا کے نقشے میں موجود ہیں جو اسلامی کہلانے کے باوجود ایسی جماعتوں سے یکسر محروم ہیں اور وہاں "دینی سیاست" نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

ان جماعتوں کا کارنامہ بھی قابل ستائش ہے کہ انہوں نے اب تک ملک میں لادینیت کے سیلاب پر بند باندھنے کے لئے اپنی جانیں لڑا رکھی ہیں، اور ان کے اثر و رسوخ کے سبب اسلام دشمن عناصر کو کھل کھیلنے کا موقع نہیں مل سکا۔

ان تمام حقائق کے ساتھ ساتھ گذشتہ دو سالوں میں ان جماعتوں کے کردار میں بعض قابل اعتراض پہلو بھی سامنے آئے ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے سنگین بھی ہیں اور نتائج کے لحاظ سے دور رس بھی، آج ہمارا قلم جو اب تک ان جماعتوں کے حق میں خوگر حمد ہی رہا ہے، ان کوتاہیوں کا گلہ کرنا چاہتا ہے۔ امید ہے کہ اسے ٹھنڈے دل سے سنا جائے گا۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہ کہنے دیجئے کہ پچھلے دو سال کی جدوجہد میں ہماری دینی سیاسی جماعتوں کے باہمی تعلقات کے طرز عمل نے اس قوم کو خاصا مایوس کیا ہے جو اسلام کے نام پر ان سے بہت کچھ آس لگائے بیٹھی تھی، قوم کو ان سے بجا طور پر یہ توقع تھی کہ ہماری تاریخ کے

اس نازک دور میں جب کہ ملک موت و حیات کی کشمکش سے گزر رہا ہے، اور اس میں اسلام کے وجود و بقا کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ ہماری دینی جماعتیں ذاتی اور جماعتی تعصبات سے بلند ہو کر کام کریں گی۔ اور مشترکہ مقاصد کے حصول میں ان اختلافات کو سد راہ نہیں بنائیں گی۔ جن کی حیثیت بہرحال ثانوی ہے۔

ہمیں سخت افسوس ہے کہ قوم کی یہ توقع نہ صرف یہ کہ پوری نہیں ہوئی، بلکہ اسے قدم قدم پر بے دردی سے کچلا گیا ہے، متحدہ محاذ تو بہت دور کی بات ہے، جزوی طور پر جو سمجھوتے کہیں کہیں ہوتے تھے، ان کی سیاہی بھی ابھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ ان کی دھجیاں بکھیر دی گئیں، اور باہمی رنجشوں کا بخار اس طرح خم ٹھونک کر نکالا گیا کہ پوری فضا طعن و تشنیع اور سب و دشنام کے غلیظ دھوئیں سے بھر گئی۔

ہر جماعت اس صورت حال کا ذمہ دار اپنی مقابل جماعت کو ٹھہراتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس افسوسناک غلطی سے کسی کا کردار صاف نہیں ہے، اس سے کون انصاف پسند انکار کر سکتا ہے کہ اظہار اختلاف کا جو طریقہ ہماری دینی سیاسی جماعتوں نے اختیار کیا، اس نے تہذیب کا دامن بھی تار تار کیا۔ اور وقت کے اہم دینی تقاضوں کو بری طرح مجروح کر کے چھوڑا، ایک شخص سے جب تک دوستانہ تعلقات رہے، اس کی تعریفوں کے پل باندھے جاتے رہے، اور جس لمحے اس سے اختلاف پیدا ہوا، اسی لمحے اس کی ذات میں اتنے کیڑے پڑ گئے کہ اس میں کوئی خوبی باقی نہ رہی، اس کا وہ ماضی بھی داغدار دکھایا جانے لگا جو دوستی کی حالت میں گزرا تھا اور پھر اس کے کسی خاص طرز عمل ہی کو نہیں، اس کی سراپا ذات کو، اس کی نجی زندگی کو اس کے حلقہ احباب کو یہاں تک کہ اس کے اکابر قائدین کو ملامتوں کا اس طرح ہدف بنایا گیا کہ شرافت منہ چھپا کر رہ گئی۔

ظاہر ہے کہ جس ماحول میں اختلافات کی کوئی حدود قائم نہ ہوں، جہاں کیچڑ اچھالنے کا مشغلہ اتنا سستا اور دوسروں کو بدنام کرنے کا عمل اتنا آسان ہو، جہاں چھوٹی چھوٹی باتوں پر اخباری بیانات کی جنگ بسوس ہر وقت تیار رہتی ہو وہاں کوئی باوقار اتحاد کس طرح قائم ہو سکتا ہے؟ اور قائم ہو جائے تو کتنے دن چل سکتا ہے؟

ہمیں اس بات کا پورا احساس ہے کہ مختلف الفکر عناصر کا کسی مشترک مقصد کے لئے جڑ جانا اتنا آسان نہیں جتنا وہ بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے، لیکن یہ بھی اپنی جگہ سچ ہے کہ یہ چیز اتنی مشکل بھی نہ تھی جتنا اسے جماعتوں کے مذکورہ طرز عمل نے بنا دیا اور پھر اس کا لازمی نتیجہ

عوام کی بددلی کی صورت میں سامنے آکر رہا۔

سیدھے سادے عوام اختلافات کی باریکیوں کو نہیں سمجھتے، نہ وہ اتحاد کی مشکلات سے پوری طرح آگاہ ہوتے ہیں، اور نہ ان سے یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ کسی کی خامی کو اسی حد تک محسوس کریں گے، جس حد تک وہ واقعتہً ہے، ■ تو جب یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کے نام لیوا آپس میں لڑرہے ہیں تو ان کے ذہن میں اس کی وجہ سوائے اس کے مشکل ہی سے آتی ہے کہ یہ سب کچھ ذاتی مفادات کے تحت ہو رہا ہے۔ چنانچہ ■ پورے اسلامی کیمپ ہی سے بددل ہونا شروع کر دیتے ہیں۔

یہ بددلی بلاشبہ غلط ہے، کسی مکان کے مالک اگر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ مکان کو لیٹروں اور ڈاکوؤں کے حوالے کر دیا جائے، لیکن یہ بات مالکوں کے سوچنے کی ضرور ہے کہ ان کی لڑائی کن لوگوں کا راستہ صاف کر رہی ہے؟

باہمی جنگ و جدال کے علاوہ ہماری دینی سیاسی جماعتوں کے طرز عمل میں کچھ اور بھی قابل اعتراض پہلو اس دوران سامنے آئے ہیں، لیکن ان کو ایک ایک کر کے گنوانے کے بجائے ہم یہ زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کہ اس سبب کی نشاندہی کر دیں جو ہماری ناقص رائے میں ان تمام خرابیوں کی اصل بنیاد ہے

ہماری نظر میں اس تمام صورت حال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی سیاسی جدوجہد کے دوران اپنی صحیح حیثیت کو مستحضر نہیں رکھا۔ ہمیں اپنی سرگرمیوں کے کسی بھی مرحلے میں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے تھی کہ ہمارا مقصد زندگی دین پہلے ہے اور اور سیاست بعد میں۔ اس لئے ہمیں اپنی جماعتوں کو شروع ہی سے اس ڈھب پر چلانا چاہئے تھا کہ ان میں دین کا رنگ سب سے نمایاں نظر آئے۔

آج کی عام سیاسی جماعتوں کا اصل محور فکر و عمل حکومت اور اقتدار ہوتا ہے، اس لئے انہیں افراد سازی کی طرف چنداں توجہ نہیں ہوتی لیکن دینی سیاست کی ساری عمارت افراد کے ذاتی کردار پر کھڑی ہوتی ہے اس لئے اس میں سب سے مقدم کام افراد سازی کا کام ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں سے ۱۳ سال مکہ مکرمہ میں گزارے جہاں افراد سازی کے سوا کوئی کام نہ تھا، تیرہ سال تک افراد کے کردار کی تعمیر کرنے کے بعد جو جماعت تیار ہوئی اس نے بدر و حنین کے معرکے سر کئے۔ پورے جزیرۂ عرب پر اسلام کا پرچم

لہرایا اور پھر دنیا کی آخری حدود تک دین حق کو بلند کرتی چلی گئی۔

افسوس ہے کہ ہماری جماعتوں نے افراد سازی کے کام پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی، اور دوسری پارٹیوں کی طرح سیاسی مقاصد کے حصول کو اپنا اصل ہدف بنا لیا ہے، ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ یہ ڈگران جماعتوں کو کبھی راس نہیں آ سکتی جن کا خمیر دین کے نام پر اٹھا ہے، یہ درست ہے کہ افراد سازی کا کام بہت دیر طلب بھی ہے اور محنت طلب بھی۔ اس میں کوئی جماعت آن کی آن میں میدان پر نہیں چھا سکتی، لیکن اس طرح جو اجتماعی وحدت تیار ہوتی ہے وہ ناقابل شکست اور ناقابل تسخیر بن کر اٹھتی ہے۔ اور بالآخر دنیا سے اپنا لوہا منوا کر چھوڑتی ہے۔

ایک مسلمان کا اصل سرمایہ خوف خدا اور فکر آخرت ہے، جب تک یہ چیز رگ و پے میں سمائی ہوئی نہ ہو، اس وقت تک اس کی سیاسی کوششیں دوسروں سے ممتاز نہیں ہوتیں، سیاست کا میدان اس اعتبار سے بھی ایک خارزار کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں نفس اور شیطان کو وسیسہ کاریوں کا بہت موقع ملتا ہے، یہاں جاہ و منصب، شہرت و نیک نامی اور عزت و مقبولیت ایسی چیزیں ہیں جو قدم قدم پر دامن دل کو کھینچتی ہیں، اور جب تک انسان نے خاطر خواہ دینی تربیت حاصل نہ کی ہو، اس وقت تک وہ اپنے ذہن کو ان سے آزاد نہیں کر سکتا ہو، ان چیزوں کا تصور جب شعوری یا غیر شعوری طور پر دل و دماغ کا احاطہ کر لیتا ہے تو پھر ذہن میں تاویلات اور مصالح کا غیر متناہی دفتر کھل جاتا ہے، اور دین کے اصل مقاصد و مصالح ان تاویلات کے انبار میں گم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اس صورت حال سے محفوظ رہنے کا اگر کوئی راستہ ہے تو " صرف انابت الی اللہ اور تعلق باللہ ہے، جس شخص کا دل اس سوز و گداز سے معمور ہو، وہ اپنے ہر اہم اقدام سے پہلے اللہ کے حضور جھکتا ہے، اس سے فریاد کر کے رہنمائی مانگتا ہے، استقامت کے لئے روتا اور گڑگڑاتا ہے، اور ہر وقت ڈرتا رہتا ہے کہ آزمائشوں کے اس پل صراط پر اس کا کوئی ڈگمگاتا ہوا قدم اسے جہنم میں نہ لے جائے۔ یہی خوف ہے جو دل سے ضد، عناد، ہٹ دھرمی اور بات کی پچ بھرنے کے جذبات کو ختم کرتا ہے، اسی سے انانیت کچلی جاتی ہے، اور اسی کے ذریعہ یہ بات ہر آن مستحضر رہی ہے کہ وہ سیاست کے میدان میں کیوں داخل ہوا تھا؟

اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور کی جس سیاست کو ہم اپنا آئیڈیل سمجھتے ہیں، اس کی بنیاد درحقیقت اسی خانقاہی تربیت پر رکھی گئی تھی، اور آج بھی اگر ہماری کوئی سیاسی کوشش بار آور ہو

سکتی ہے تو اس کے سوا اس کا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

لہٰذا ہماری تجویز ہے کہ ہماری دینی سیاسی جماعتیں اپنے پروگرام پر نظر ثانی کر کے اپنی توجہات افراد سازی کی طرف خاص طور پر مرکوز کریں۔ اپنے ارکان کو قرآن و سنت، انبیاءؑ و صحابہؓ اور صلحاؒ کی سیرتوں اور بزرگان دین کی دوسری ایسی کتابوں کا مطالعہ کرائیں۔ جو دل میں سوز و گداز پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، نیز انہیں بزرگان دین کی صحبت کا عادی بنائیں، اس غرض کے لئے ضروری ہے کہ جماعتی پروگرام میں ایسے اجتماعات رکھے جائیں جن میں صرف اصلاح اعمال و اخلاق کے کام کا جائزہ لیا جائے اور اجتماعی طور پر اہل اللہ کے ملفوظات پڑھے جائیں، الیکشن کے ہنگامی کاموں سے فراغت کے بعد امید ہے کہ اس کام کا اچھا موقع مل سکے گا۔

اس تربیتی پروگرام کے زمانے میں ہر قسم کے اختلافات کو ان کی صحیح حدود میں رکھنے کی عادت ڈالی جائے، اپنی ذات پر تنقید، بلکہ سب و شتم تک کو صبر و سکون اور تحمل کے ساتھ سننے اور اشتعال کے شدید مواقع پر بھی دین کے اہم تقاضوں کو پیش نظر رکھنے کا ملکہ پیدا کیا جائے۔ اگر اس کام کی طرف کماحقہ توجہ دی گئی تو امید ہے کہ انشاء اللہ ان بہت سی خرابیوں کا انسداد ہو سکے گا جو پچھلے دنوں سامنے آئی ہیں۔

مسئلہ قومیت

مسلم قومیت کا تصور

ـــــــاور حکومت کا طرز عمل

پاکستان اس لحاظ سے دنیا کا ایک منفرد ملک ہے کہ اس کا قیام دنیا کی عام روش سے ہٹ کر ایک نرالے نظریہ کی بنیاد پر عمل میں آیا تھا۔ یعنی یہ کہ ہندوستان میں رہنے والے مسلمان ایک جداگانہ قومیت کے حامل ہیں اور انہیں اپنے دین اور اپنے عقیدے کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے الگ وطن کی ضرورت ہے دین کی بنیاد پر مملکت قائم کرنے کا نعرہ ایک ایسے دور میں بلند کیا گیا تھا جب پوری دنیا میں وطنی قومیت (Nationalism) کا سکہ چل رہا تھا۔ اس لئے جہاں اس مطالبہ کو دنیا سے منوانے کے لئے انتھک جدوجہد کی ضرورت تھی، وہاں اس سے زیادہ ضرورت اس بات کی تھی کہ جب مسلمانوں کی یہ آزاد مملکت حاصل ہو جائے تو اس کی تعمیر بھی اس انداز سے کی جائے کہ اس کی ایک ایک اینٹ میں مسلم قومیت کا یہ نظریہ رچا بسا ہوا ہو۔

افسوس یہ ہے کہ ایمان کی حرارت والوں نے پہلا مرحلہ تو بڑے جوش و خروش کے ساتھ سر کر لیا لیکن جب اس ملک کی تعمیر و ترقی کا مرحلہ آیا تو یہ فراموش کر بیٹھے کہ ہم کہاں سے چلے تھے؟ کیوں چلے تھے؟ اور اس ملک کے قیام کا اصل مقصد کیا تھا؟

مسلم قومیت کا یہ نظریہ پاکستان کے صرف قیام ہی کے لئے ضروری نہ تھا، بلکہ اس کی ترقی و بقاء کے لئے بھی ناگزیر تھا، زمانے کی عام فضا چونکہ وطنی قومیت کے نظریہ سے مرعوب و متاثر

اور مسلم قومیت کے نظریہ سے نا آشنا تھی اس لئے اس ملک کو باقی رکھنے کے لئے کچھ ایسے انقلابی اقدامات کی ضرورت تھی جو اس نظریہ کو محض ذہن و فکر کے نہاں خانوں سے نکال کر عمل کی جیتی جاگتی دنیا میں لے آئیں، اور ذہنوں پر چھائے ہوئے وطنی قومیت کے طلسم کو توڑ سکیں۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ اس ملک میں اسلامی قوانین نافذ ہوں، اسلامی تعلیمات عام ہوں، مسلمان ذہنیت کو فروغ ہو، علاقائی تعصبات کی تمام نشانیاں فنا کی جائیں، اسلامی وحدت و اخوت کو اس ملک کی رگ و پے میں سمویا جائے، علامت کی بنیاد پر ہونے والی حق تلفیوں کا قلع قمع ہو اور ملک بھر میں ایسی فضا پیدا کی جائے جس سے یہ بات ہر شخص کے ذہن نشین ہو جائے کہ وہ ایک ملت مسلمہ کا فرد ہے اور اس کے حقوق و فرائض تمام باشندگان ملک کے مساوی ہیں۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ان میں سے ایک کام بھی نہ ہو سکا، کچھ تو شاید اس لئے کہ ذہنوں میں ان کاموں کی اہمیت اتنی زیادہ نہ تھی جتنی پاکستان بنا دینے کی تھی، اور کچھ اس لئے کہ جن لوگوں نے اس ملک کے قیام میں عملی حصہ لیا تھا، اور جنہوں نے اس مقصد کے لئے قربانیاں دی تھیں، وہ ایک ایک کر کے جلد ہی دنیا سے رخصت ہو گئے اور جن لوگوں کے ہاتھ میں پاکستان کی باگ ڈور آئی وہ اس جذبہ و مقصد سے نا آشنا تھے جس نے اس ملک کے قیام میں سنگ بنیاد کا کام کیا تھا۔

بہر کیف! ہوا یہی کہ پاکستان بننے کے بعد مسلم قومیت کا نظریہ محض ایک ہوائی نعرہ ہو کر رہ گیا جسے صرف اپنی بے انصافیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ورنہ عمل کی دنیا میں اس کے تقاضوں کو قدم قدم پر کچلا گیا۔ زبان سے یہی کہا جاتا رہا کہ یہ ملک اسلام کے لئے بنا ہے لیکن عملی طور پر اسلام کی ایک ایک قدر کو مٹا دیا گیا دعویٰ کیا جاتا رہا کہ تمام مسلمان ایک قوم ہیں اور سندھی، پنجابی، بنگالی، پٹھان، اور بلوچ میں کوئی امتیاز نہیں، لیکن عملاً صوبائی تعصبات کی سرپرستی کی گئی اس کا نتیجہ جو ہونا تھا وہ ہوا کہ مسلم قومیت کا تصور روز بروز کمزور پڑتا چلا گیا اور لوگ یہ سمجھنے لگے کہ یہ نظریہ محض دھوکہ دینے لئے اختیار کیا گیا تھا، چنانچہ وطنیت کا تصور جو دنیا بھر میں چلا ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ غالب آتا گیا، اور اسی نے بالآخر ملک کا نصف سے زیادہ حصہ کاٹ کھایا۔

سقوط مشرقی پاکستان کے بعد ہمیں ہوش آجانا چاہئے تھا، اب بچے کھچے پاکستان بچانے کی صرف یہی صورت تھی کہ مسلم قومیت کے اس تصور کو پھر زندہ کیا جائے جس نے پاکستان بنوایا

تھا، لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارے ارباب اقتدار شاید اب بھی یہی سمجھے بیٹھے ہیں کہ یہ صرف بیانات اور تقریروں سے زندہ ہو جائے گا اور اس تصور کے خلاف صوبائیت کی خطرناک سازشیں صرف قید خانے بھر دینے سے ختم ہو جائیں گی حالانکہ صوبائیت کے ہاتھوں ایسی چوٹ کھانے کے بعد یہ خود فریبی انتہائی مایوس کن ہے۔

علاقائی عصبیت کی تحریک ایک ایسی فکری تحریک ہے جس نے پوری ہوشیاری اور چالاکی کے ساتھ ذہنوں پر قبضہ جمایا ہے، اس تحریک کو پروان چڑھانے کے لئے سالہا سال کام کیا گیا ہے اس غرض کے لئے نت نئے حربے اختیار کئے گئے ہیں، طرح طرح کی تدبیریں سوچی گئی ہیں اور اس زہر کو پھیلانے کے لئے ایسے مخفی راستے تلاش کئے گئے ہیں جن سے یہ زہر غیر شعوری طور پر ذہنوں کو متاثر کرتا چلا جائے تب جا کر یہ تحریک اس لائق ہوئی ہے کہ کھلم کھلا صوبائی تعصبات کی تبلیغ کر سکے۔ لہٰذا اس شیطانی تحریک کو کچلنے کے لئے محض ہوائی تقریریں یا محض جبر و تشدد کے اقدامات کافی نہیں ہوسکتے اس کے لئے جوش اور ہوش کے حکیمانہ امتزاج کی ضرورت ہے اور ایک ایسی سوچی سمجھی حکمت عملی درکار ہے جو صرف صوبائی تعصبات کی نفی ہی نہ کرے بلکہ اس کے متبادل مسلم قومیت کو ایک عملی حقیقت بنا کر پیش کر سکے۔

اس کام کے لئے........... قانون و معیشت سے لے کر تعلیم اور معاشرت تک زندگی کے ہر شعبے میں انقلابی اقدامات کی ضرورت ہے، اس ملک میں اسلام کو صحیح معنی میں نافذ کیجئے، اپنے چپہ چپہ کو اسلامی تعلیمات کا دلکش نمونہ بنایئے خدا کا خوف اور آخرت کی فکر پیدا کیجئے، اسلام کے لئے جینے اور مرنے کا جذبہ ابھاریئے، نظام تعلیم کی اصلاح کر کے اس میں سے علاقائیت کے زہریلے مواد کو نکالئے، نشر و اشاعت کے ذرائع کو محض تسکین ہوس کا ذریعہ بنانے کے بجائے مسلمان ذہنیت کی تعمیر کرنے کے لئے استعمال کیجئے، ناانصافیوں کا خاتمہ کیجئے، فحاشی و عریانی اور اسلام کے منافی تمام حرکات کو مٹایئے اور اسلامی تہذیب و معاشرت کو گھر گھر عام کیجئے۔

یقین رکھئے کہ صوبائی تعصبات کی یہی تحریکیں ہمیشہ خدا فراموشی اور بد دینی کی گندی فضا میں پروان چڑھتی ہیں، اور جس دن آپ نے اپنے ملک کو اس گندگی سے پاک کر لیا اس دن سندھو دیش، آزاد بلوچستان اور پختونستان کی یہ تحریکیں اپنی موت آپ مر جائیں گی۔ لیکن جب تک ان مقدس مقاصد کی طرف آپ کے قدم خلوص کے ساتھ آگے نہیں بڑھتے اس وقت تک محض اتحاد و یک جہتی کے خوبصورت وعظ کچھ کام نہیں آسکتے۔

پاکستان کے مستقبل کے بارے میں جس چیز سے سب سے زیادہ ڈر لگتا ہے ▪ یہ ہے کہ ابھی تک اس ٹھوس کام کی طرف ان لوگوں کی توجہ بھی نہیں ہے جو دن رات پاکستان کی وحدت و سالمیت اور مسلم قومیت کے نظریہ کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ ہمارے اربابِ اقتدار بھی آئے دن ایسے اقدامات کرتے رہتے ہیں جن سے شعوری یا غیر شعوری طور پہ مسلم قومیت کا تصور کمزور پڑتا اور صوبائیت کا عفریت طاقتور ہوتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ بعض اقدامات کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ یہ حکومت کے کئے ہوئے یا ان صوبہ پرست عناصر کے جو مسلم قومیت کے تصور پر ضربیں لگانے میں مصروف ہیں۔ چنانچہ صوبہ پرست عناصر چار قومیتوں کے نعرے لگا رہے ہیں تو حکومت کی سرپرستی میں چار ثقافتوں، اور چار تہذیبوں کے تصور کو فروغ دیا جا رہا ہے، ابھی "سندھ صدیوں کے آئینے میں" کے زیر عنوان سندھی ثقافت پر جو تقریبات باقاعدہ حکومت کی طرف سے منعقد کی گئیں ان کے بارے میں کوئی تصور کر سکتا ہے کہ یہ اس حکومت کے زیر اہتمام ہوئی ہوں گی جو دن رات وحدت ملی اور مسلم قومیت کا درس دیتی ہے لیکن یہ تقریبات باقاعدہ اقتدار کے زیر سایہ منعقد ہوئیں اور ان میں جن تنگ ملت خیلات کا اظہار کیا گیا وہ ہم سب کے لئے باعث شرم ہیں۔

ہمیں اس پر چنداں اعتراض نہیں کہ ہر علاقے کے باشندے اپنے ▪ اپنے طرز بود و ماند پر (اسلامی احکام کے مطابق) عمل پیرا رہیں اور اس کا تحفظ کریں۔ لیکن یہ کیا کہ اس طرز بود و ماند کو ایک مستقل قومیت کی بنیاد بنا کر پیش کیا جائے؟ اور اسے اس درجہ اہمیت دی جائے کہ دین اور عقیدے کے رشتوں کو توڑ کر کسی سیاسی وحدت کی شکل اختیار کر لے اور اپنے پرائے کی حد فاصل بن جائے؟

اس طرح پاکستان کے مختلف علاقوں میں پرانی تہذیبوں کے بہت سے آثار قدیمہ پائے جاتے ہیں، موہن جوڈارو، ہڑپہ، ٹیکسلا، تخت بائی اور کوٹ ڈی جی کے یہ آثار قدیمہ علمی اور تاریخی اعتبار سے بلاشبہ اہمیت کے حامل ہیں اور اسی لحاظ سے ان کی حفاظت میں مضائقہ نہیں، لیکن جب ان کھنڈرات کو پاکستانیوں کی اپنی تہذیبی یادگار کی حیثیت دی جاتی ہے اور انہیں ثقافتی ورثہ قرار دیا جاتا ہے۔ تو اس طرز عمل سے مسلم قومیت کے اس نظریہ پر کاری ضرب لگتی ہے جس نے پاکستان بنایا تھا۔ سوال یہ ہے کہ پاکستان اور پاکستانیوں سے ان اجڑی ہوئی بستیوں کا آخر اس کے سوا اور کیا تعلق ہے کہ جب برصغیر تقسیم ہوا تو ان کے یہ کھنڈرات ہمارے حصے میں آگئے تھے؟ لیکن افسوس ہے کہ ہماری حکومتوں کی طرف سے یہ ہمیشہ ان آثار

قدیمہ کو اپنی تاریخی یادگار کی حیثیت دی جاتی رہی ہے اور بیانات اور تقریروں کے علاوہ تعلیمی نصاب کی کتابوں تک میں ان کا تذکرہ اسی انداز سے کیا جاتا ہے جیسے یادگاروں کو قومی اور ملی تقدس حاصل ہے۔ حیرت ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے کبھی ہی نہیں سوچا کہ اس طرز عمل سے کیا ذہنیت تیار ہو گی؟ اور ایسی ذہنیت تیار کر کے ہم مسلم قومیت کے اس تصور کو کیسے باقی رکھ سکیں گے جو پاکستان کی وحدت و سالمیت کا ضامن ہے؟

بہر حال! ہماری آج کی گذارشات کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہمارے ارباب اقتدار یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان قائم رہے اور وہ صوبائی تعصبات کا شکار ہو کر مزید تقسیم در تقسیم کے خطروں سے محفوظ ہو تو اس کے لئے "وحدت پاکستان" کے صرف زبانی وعظ ہر گز کافی نہیں ہوں گے اور نہ صرف چند صوبہ پرست رہنماؤں کو بند کر دینے سے یہ مقصد حاصل ہو سکے گا، حالات اب اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ اس کام کے لئے انتہائی حکمت و تدبر، دور اندیشی اور جذبہ عمل کی ضرورت ہے۔ اس مرض کا مداوا اگر ہو سکتا ہے تو وہ صرف مسلم قومیت کے تصور کو عملی شکل دینے سے ہو سکتا ہے جس کے لئے اسلامی نظام حیات کے نفاذ کی طرف فوری توجہ ضروری ہے اور ایسے جس سے ہمارا رشتہ اسلام کی بجائے قدیم کافرانہ تہذیبوں سے جڑتا ہو، اللہ تعالیٰ ہمارے ارباب اقتدار کو فکر سلیم عطا فرمائے اور انہیں توفیق دے کہ وہ اس نازم موقع پر ملک و ملت کے لئے صحیح اور مفید راہ عمل اختیار کر سکیں۔

محمد تقی عثمانی

۱۴ ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ

و ما علینا الا البلاغ

وطن کی محبت اور عصبیت

زمین کے جس خطے کو انسان اپنا وطن سمجھتا ہے، اس کے ساتھ ایک خصوصی لگاؤ کا پیدا ہو جانا بلاشبہ انسانی فطرت کا ایک تقاضا ہے، اور اس تقاضے سے کسی حال صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ جس جگہ انسان پیدا ہوتا ہے جہاں اس کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں، جہاں وہ بچپن کی شوخیوں اور جوانی کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے، جس جگہ پہلی بار زندگی کے مختلف روپ اس کے سامنے آتے ہیں، اس جگہ سے اسے ایک خاص انس پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان اس سرزمین سے، وہاں کے بسنے والوں سے، اس کی زبان سے یہاں تک کہ اس کے گلی کوچوں اور درودیوار سے محبت کرنے لگتا ہے، اور بہت شاذونادر ہوتے ہیں وہ لوگ جن کا دل اس محبت سے یکسر خالی ہو۔

وطن کی محبت اگر صرف اس حد تک ہو تو یہ کوئی بری بات نہیں۔ اسلام نے بھی اس فطری محبت پر کوئی پابندی عائد نہیں کی، حدیث میں ہے کہ مدینہ طیبہ کو وطن قرار دینے کے بعد جب کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی سفر سے واپس تشریف لاتے اور دور سے جبل احد نظر آتا تو آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

هذا جبل يحبنا و نحبه

یہ وہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں

لیکن اگر یہی محبت اپنی معقول حدود سے تجاوز کر جائے، اور اس کی وجہ سے انسان وطن کی ہر چیز کو "اپنی" اور باہر کی ہر چیز کو "پرائی" سمجھنے لگے تو اسی کا نام "عصبیت" ہے اور اس سے اسلام شدید نفرت کرتا ہے، گویا اسلام میں وطن کی طبعی محبت کا تو پورا لحاظ رکھا گیا ہے لیکن نہ وہ اسے اجتماعی وحدت کی بنیاد قرار دیتا ہے، نہ وہ اس کے نزدیک دوستی اور دشمنی یا محبت اور نفرت کا معیار ہے، نہ اس کی بناء پر اعلیٰ اور ادنیٰ کی تفریق قائم کی جا سکتی ہے اور نہ

اس کے پیش نظر حق و ناحق کے فیصلے ہو سکتے ہیں۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر آپ وطن سے باہر کسی مقام پر ہوں، اور وہاں آپ کو اپنے وطن کا کوئی آدمی نظر آجائے تو طبعی بات ہے کہ آپ اسے دیکھ کر خوشی محسوس کریں گے، اس سے باتیں کرنے اور وطن کے حالات معلوم کرنے میں آپ کو لطف آئے گا۔ یہ وطن کے ساتھ آپ کی فطری محبت کا اثر ہے اور یہ بات اسلام کی نظر میں قابل اعتراض نہیں لیکن اگر کل کو آپ کا وہی ہم وطن کسی مقامی آدمی سے الجھ پڑے اور آپ حق و ناحق کو دیکھے بغیر صرف اس بناء پر اس کا ساتھ دینے لگیں کہ " آپ کا ہم وطن ہے تو یہ خالص عصبیت ہے، اور اسلام اس کا کسی طرح روادار نہیں۔

اسی طرح اگر آپ اپنے کسی ہم وطن کو حکومت کے کسی اعلیٰ منصب پر فائز دیکھ کر خوش ہوتے ہیں تو یہ وطن کے ساتھ آپ کی طبعی محبت کا نتیجہ ہے جس پر اسلام کوئی قدغن نہیں لگاتا، لیکن اگر کسی حکومت کے ساتھ آپ محض اس بناء پر تعاون نہیں کرتے کہ اس کی باگ دوڑ آپ کے ہموطن کے ... ہاتھ میں نہیں ہے، یا آپ کسی آدمی کو محض اس لئے حکومت کا کوئی عہدہ دلانا چاہتے ہیں کہ آپ کے وطن کا رہنے والا ہے، حالانکہ اس منصب کے لئے باہر کے لوگوں میں اس سے زیادہ اہلیت رکھنے والے موجود ہیں، تو یہ نری عصبیت ہے اور اسلام اسے کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

یا ایھا الناس انا خلقنا کم من ذکرا و انثی وجعلناکم

شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خوب کھول کر یہ حقیقت بیان فرما دی ہے کہ اس دنیا میں انسانوں کے درمیان رنگ و نسل اور زبان و وطن کی جو تفریق کی گئی ہے اس کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اس کے ذریعہ لوگ ایک دوسرے کی ٹھیک ٹھیک شناخت کر سکیں۔ ورنہ

جہاں تک عزت و ذلت اور بڑائی چھوٹائی کا تعلق ہے، اس کی بنیاد تمام تر انسان کے ذاتی اعمال و اوصاف پر ہے، جو اللہ سے زیادہ ڈرتا ہے اور اس کے احکام کی زیادہ پیروی کرتا ہے وہ زیادہ عزت والا ہے، خواہ کسی وطن کسی قبیلے کا ہو، اور جو شخص اس معاملہ میں کوتاہی کرتا ہے ▪ عزت و شرف سے محروم ہے، خواہ کسی رنگ و نسل سے تعلق رکھتا ہو۔

عصبیت کا مزاج قرآن کریم کی اس تعلیم کے بالکل خلاف ہے، اس کی نگاہ میں غیر قوم، یا غیر وطن کا آدمی ایک مہمان کی حیثیت سے تو اچھے سے اچھے سلوک کا مستحق ہو سکتا ہے، لیکن اسے "اپنا" کسی حال میں نہیں سمجھا جا سکتا، وہ علم و فضل کے اعتبار سے خواہ کتنے مقام بلند پر فائز ہو، اخلاق و کردار کے لحاظ سے خواہ کتنا اونچا مقام رکھتا ہو، جسمانی اور فکری صلاحیتوں سے خواہ کتنا مالا مال ہو، لیکن "عصبیت" اسے یہ حق دینے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہے کہ وہ قوم و وطن کے لوگوں میں رہ کر ان سے زیادہ عزت کا مقام حاصل کرے، زندگی کے مسائل میں ان کا رہنما بنے یا ان پر کسی بھی درجے میں حکمرانی کر سکے۔

یہی وہ "جاہلی عصبیت" ہے جس کے خلاف اسلام نے روز اول سے جہاد کیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے بار بار اس غیر انسانی جذبے کو ختم کرنے کی کوشش فرمائی، اور اس کوشش میں اس حد تک کامیابی حاصل کی کہ عرب کے بسنے والوں نے ایک طرف حبشہ کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ اور فارس کے سلمانؓ کو آگے بڑھ کر گلے لگا لیا، اور دوسری طرف اپنی قوم اور وطن کے ابوجہل و ابولہب کے خلاف تلوار لے کر نکلے، اور عملاً اس بات کا اعلان کر دیا کہ جو خدا کا دوست ہے وہ ہمارا ہے، خواہ کسی ملک و قوم کی طرف منسوب ہو، اور جو خدا کا دشمن ہے وہ ہمارا نہیں ہے، خواہ گوشت پوست کے اعتبار سے وہ ہم سے کتنا قریبی رشتہ رکھتا ہو۔

فتح مکہ کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واشگاف الفاظ میں اعلان فرمایا کہ:

«معشر قریش! إن الله قد اذهب عنكم نخوة الجاهلية و تعظمها بالآباء»

"قریش کے لوگو! اللہ نے تم کو جاہلیت کی جھوٹی نخوت سے نجات دے دی ہے اور باپ دادا کی بنیاد پر بڑائی جتلانے کا دستور ختم کر دیا ہے۔"

اور حجۃ الوداع کے خطبے میں ایک لاکھ سے زائد عربی النسل صحابہ کرامؓ کے مجمع کے سامنے آپؐ نے اس سے زیادہ واضح الفاظ میں اعلان فرمایا کہ:

ایھا الناس ان ربکم واحد و ان اباکم واحد، کلکم لآدم و ادم من تراب. اکرمکم عند اللہ اتقاکم و لیس عربی علی عجمی فضل الا بالتقوی، الا کل شیئ من امر الجاھلیۃ تحت قدمی موضوع.

"اے لوگو! تم سب کا پروردگار ایک ہے، اور تم سب کا باپ ایک ہے، تم سب آدمؑ کے بیٹے ہو، اور آدمؑ مٹی سے پیدا ہوئے تھے، تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو، کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے سبب سے، کان کھول کر سن لو! کہ جاہلیت کی تمام رسمیں میرے پاؤں تلے روندی گئی ہیں۔"

قرآن و سنت کی ان واضح ہدایات کے بعد یہ تصور مشکل ہی سے آتا ہے کہ لاالہ الا اللہ پر ایمان رکھنے والا کوئی مسلمان جاہلیت کی اس جھوٹی نخوت کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دے گا جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاک میں ملایا تھا، لیکن خدا جانے کتنی تیرہ و تار گمراہیاں ابھی ہماری قسمت میں ہیں کہ آج قرآن و سنت ہی کے نام لیوا پوری ڈھٹائی کے ساتھ جاہلیت کی ان متعفن نشانیوں کو زندہ کر رہے ہیں۔ "عصبیت" کے وہ آدم خور بت جنہیں اسلام نے ایک ایک کر کے پیوند زمین کیا تھا، آج اسلام کو ماننے والے ان ہی بتوں کو پھر سے کھڑا کر رہے ہیں اور مسلمان کہلانے والوں کا ایک انبوہ ہے جو پوری تقدیس و احترام کے ساتھ انہیں سینے سے لگا رہا ہے ـــــ کچھ عرصے پہلے تک ہمیں اپنے بعض بھائیوں سے یہ شکوہ تھا کہ وہ فرعون کی اولاد ہونے پر فخر کرتے ہیں لیکن ان گنہگار آنکھوں کو یہ منظر بھی دیکھنا تھا کہ اس

ملک میں جس کا خمیر ہی اسلام کے نام سے اٹھا ہے کہنے والے ڈنکے کی چوٹ یہ کہہ رہے ہیں کہ "راجہ داہر ہمارا ہیرو ہے اور محمد بن قاسم ایک لیٹرا تھا" ۔ ـــــ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

"جئے سندھ" کی جو تحریک آج کل سابق صوبہ سندھ کے علاقے میں چلی ہے، اگر وہ صرف وطن کی طبعی محبت کی حد تک محدود ہو۔ اور "جئے سندھ" کے نعرے کا مطلب محض ایک دعا ہو، تو ہم ہزار بار اس نعرے سے ہم آواز ہونے کو اپنی سعادت سمجھیں گے، تہ دل سے ہماری دعا ہے کہ یہ خطہ جئے، قیامت تک جئے، پھل پھول کر اور خوش حال ہو کر جئے لیکن جب اس نعرے کے پیچھے عصبیت کا وہ بدبودار ذہن کام کر رہا ہو جو محمد بن قاسم" جیسے فخر انسانیت رہنما سے نفرت کرنا اور راجہ داہر جیسے ننگ انسانیت دیو استبداد سے محبت کرنا سکھاتا ہے، تو آخر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ اس تحریک کی بنیاد میں معقولیت کا کوئی چھینٹا بھی پڑا ہے؟

ایک زمانہ تو وہ تھا جب خود راجہ داہر کے ہم مذہب محمد بن قاسم" کو اپنا ہیرو قرار دے کر اس پر عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کیا کرتے تھے، اور اس کے پسینے کی جگہ اپنا خون بہانے کو اپنی سعادت سمجھتے تھے، اور چشم فلک آج یہ بھی دیکھ رہی ہے کہ محمد بن قاسم" کے ہم مذہب اسے لٹیرا قرار دے کر راجہ داہر کی قبر پر پھول چڑھا رہے ہیں۔

ان کی اس انسانیت سوز حرکت سے محمد بن قاسم" کی عظمتوں میں تو ذرہ برابر کمی نہیں آتی، کہنے والے کچھ کہا کریں ان کے کہنے سے تاریخ عالم کے اس مایہ ناز کردار پر کوئی حرف نہیں آتا، اگر اس کائنات میں حق و صداقت کا لفظ کوئی معنی رکھتا ہے تو انسانیت کا ضمیر اس کی بے داغ اور قابل رشک جوانی پر ابدالا آباد تک سلام بھیجے گا لیکن سوال یہ ہے کہ یہ نعرہ بلند کرنے والے خود اپنے وطن، اپنے خطے اور اپنی سرزمین کے ساتھ کیا انصاف کر رہے ہیں؟ سندھ کے خطے نے ماضی میں علم و دین کی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں، اس کی تاریخ علم و فضل اور ورع و تقویٰ کی عظیم شخصیتوں سے مالا مال رہی ہے، اور ان ہی شخصیتوں کی وجہ سے اس خطے کو پورے عالم اسلام میں عزت و احترام کے ساتھ دیکھا جاتا ہے،

کیا اب راجہ داہر کو اپنا ہیرو قرار دینے والے حضرات یہ چاہتے ہیں کہ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک پورا عالم اسلام یہ سمجھ بیٹھے کہ سندھ کا یہ مردم خیز خطہ پھر سے راجہ داہر کے نام لیواؤں کا مرکز بن گیا ہے؟ اور اب یہاں محمد بن قاسم کے دوست نہیں، دشمن بستے ہیں؟ اگر خدانخواستہ ان کی اس تحریک سے یہ تصور ذہنوں میں قائم ہو گیا تو کیا عالم اسلام میں مسلمانوں کے اس محبوب خطے کا کوئی ادنیٰ وقار باقی رہ سکے گا؟ عالم اسلام تو پھر مسلمان ہے، ہمیں تو یہ یقین ہے کہ یہ نعرہ دنیا کے جس گوشے میں پہنچے گا، اگر وہاں عدل و انصاف کی کوئی پرچھائیں پڑی ہے، تو اس نعرے کی مذمت ہی کی جائے گی۔ کیا یہی وہ انصاف ہے جو یہ لوگ سندھ کے خطے کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ علاقائی عصبیت کے یہ افسوسناک نعرے، خواہ جئے سندھ کی شکل میں ہوں یا پختونستان کی شکل میں ہوں، ہرگز اس لائق نہیں ہیں کہ ان پر کوئی علمی تبصرہ کیا جائے یا ان کی تردید میں دلائل پیش کئے جائیں، لیکن ہمارے زمانے کا نوجوان اس قدر مظلوم ہو چکا ہے کہ اس کو جوش میں لانے کے لئے بس ایک خوش آواز نعرہ چاہئے۔ اگر اس نعرہ میں کوئی ادنیٰ دلکشی ہے تو اس کی ہلاکت آفرینی سے بچانے کے لئے اس کو دی جانے والی تعلیم اس کی کوئی مدد نہیں کرتی۔ علاقائی عصبیت کی تحریک بھی چونکہ وطن کی محبت کے نام پر اٹھی ہے، اس لئے بہت سے سادہ لوح نوجوان اس کے پیچھے بھی چل پڑے ہیں، اور تعلیم تو انہیں ایسی دی ہی نہیں گئی کہ وہ اس کے عواقب و نتائج کو سوچ سکیں۔

اس بات کا اندازہ کرنے کے لئے سابق صوبہ سندھ کی ایک طالبہ کا ایک خط ملاحظہ فرمایئے۔ جو روزنامہ حریت کراچی شائع ہوا ہے، یہ محترمہ اس تحریک کی تائید کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

> "راجہ داہر ایک سندھی تھا، چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان ہمارا ہیرو ہے ... وقت آنے پر یہ ثابت ہو جائے گا کہ ہم سندھی محمد بن قاسم پر لعنت بھیجتے ہیں، پر لعنت بھیجتے ہیں، شاہ لطیف کو سلام کرتے ہیں، جی ایم سید کو سلام کرتے ہیں سندھ کی عظمت اسلام سے نہیں، موہن جوڈارو سے ہے، لاکھوں اسلام اس پر قربان ہو جائیں، ہمارا نعرہ ہے مرسوں مرسوں پر سندھ نہ ڈیسوں، ہم لڑکیوں نے یہ طے کیا ہے کہ اپنے بچوں کے نام داہر، ہیموں کلالانی، شیخ ایاز اور ہوشو کے نام پر

رکھیں گے۔"

(حریت میگزین ۱۸ نومبر ۱۹۶۸ء)

اور ایک اور محترمہ لکھتی ہیں:۔

"وہ اسلام اور پاکستان جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے، ایسے اسلام اور پاکستان کو ہم اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں، یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے۔ سندھ کی عظمت سندھ کے سادہ لوح بہادر عوام ہیں، سندھ موہن جوڈارو، کوٹ ڈیجاں کے آثار قدیمہ اور لطیف، سچل، ایاز، جی ایم سید کی طرح کے شاعروں اور دانشوروں کی وجہ سے عظیم ہے، وہ اپنی تہذیب کی وجہ سے عظیم ہے۔"

ان خطوط کو پڑھ کر افسوس کا جتنا چاہے اظہار کر لیجئے اور اس جیسی تحریریں لکھنے والوں کو جس برے لقب سے چاہے یاد کر لیجئے، لیکن کیا اصل قصور اس مغربی نظام تعلیم کا نہیں ہے جسے اب تک ہم نے نوجوانوں کے سروں پر لاد رکھا ہے؟ ہماری نگاہ میں اس ذہنیت کی سب سے بڑی ذمہ داری اس تعلیم پر عائد ہوتی ہے جو نوجوانوں کو اب بھی دی جا رہی ہے اور جس کی موجودگی میں اسلامی مزاج و مذاق کے لئے ان کے دل و دماغ کا ہر دروازہ بند ہے "اسلامیات" کے گھنٹے میں اسلام کی برتری کے چند کھوکھلے الفاظ وہ خواہ کتنی مرتبہ رٹتے ہوں، لیکن دوسرے تمام گھنٹوں میں ان کی رگ و پے کے اندر تو مغرب کے وہی نظریات سماتے ہیں جن کی رو سے انسان کی جنم بھومی اس کے عقیدے اور اس کی فکر پر بھی فوقیت رکھتی ہے۔

اگر آپ موجودہ نصاب تعلیم کا ٹھنڈے دل کے ساتھ جائزہ لیں تو قومیت کا مغربی تصور اس کی رگ رگ میں بسا ہوا نظر آئے گا، اور جب تک یہ صورت حال برقرار رہے، عصبیت کی کوئی آواز تعجب خیز نہ ہونی چاہئے، حقیقت یہ ہے کہ ذہنوں کو عصبیت کے زہریلے جراثیم سے پاک کرنے کا راستہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس نصاب تعلیم پر پوری سنجیدگی کے ساتھ نظرثانی کر کے اسلامی قومیت کا وہ تصور طلباء کو گھٹی میں پلایا جائے جس کی بنیاد پر پاکستان بنا تھا۔

عصبیت کے پھلنے پھولنے کا دوسرا سبب ہماری ایک اور زبردست حماقت ہے اور وہ یہ کہ ہم اب تک موہن جوڈارو، کوٹ ڈی جی، ہڑپہ، ٹیکسلا اور تخت بائی کو اپنی تہذیب و ثقافت کے

مراکز کی حیثیت سے پیش کرتے رہے ہیں، خدا جانے اس میں سادہ لوحی کا دخل ہے یا کسی سازش کا، کہ اب یہ آثار قدیمہ "پاکستانی ثقافت" کے آئینہ دار سمجھے جانے لگے ہیں۔ اور عام طور سے ان کا تذکرہ اسی عقیدت محبت کے ساتھ کیا جانے لگا ہے گویا ہماری تہذیبی عظمتوں کا اصل سبب ہیں اور ہمارے ماضی کی یادگار ہیں۔ لیکن خدا کے لئے سوچئے کہ کیا اس تصور میں معقولیت کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی ہے؟ آخر موہن جوڈارو اور ٹیکسلا کی خالص غیراسلامی تہذیبوں سے ہمارا واسطہ کیا ہے؟ ہم کس بناء پر ان کی ثقافت کو اپنی ثقافت کہتے ہیں؟ کیا صرف اس لئے کہ جب برصغیر تقسیم ہوا تو یہ کھنڈرات ہمارے حصے میں آگئے تھے؟ اگر یہی طرز فکر اختیار کرنا ہے تو ہمیں "جئے سندھ" "پختونستان" اور "مشرقی پاکستان کی خود مختاری" کی تحریکوں کا کوئی شکوہ کرنے کا حق نہیں پہنچتا____

یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ ابھی عصبیت کی تحریکیں ہر جگہ محدود حلقوں میں ہیں، اور مسلمانوں کی اکثریت ان کی مخالف ہے (سابق) سندھ کے چند افراد راجہ داہر کے نام سے خواہ کتنے خوش ہو لیتے ہوں لیکن اس خطے کے نیک دل اور اسلام کے نام پر جان نثار کرنے والے عوام کی اکثریت اس نعرے کو نفرت ہی کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اسی رمضان میں سندھ ہی کے غیور مسلمانوں نے "یوم فتح باب الاسلام" منا کر محمد بن قاسم" کو جو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ سندھ کے عوام اپنی اسلامی روایات کی حفاظت کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہیں۔

لیکن جن راستوں سے عصبیت کا یہ ذہن آرہا ہے، اگر ابھی سے ان کی طرف کماحقہٗ توجہ نہ کی گئی اور اسلام کو اپنی حقیقی صورت میں اس ملک کے اندر نافذ نہ کیا گیا تو یاد رکھئے کہ عصبیت کے یہ جذبات پوری قوت کے ساتھ ہمارے اتحاد پر حملہ آور ہوں گے۔ آج صرف راجہ داہر کو ہیرو کہا گیا ہے، کل رنجیت سنگھ اور مہاراجہ بھاؤ کو ہیرو کہا جائے گا۔ اور پھر صرف

محمد بن قاسم ہی نہیں محمود غزنوی"، ظہیر الدین بابر اور احمد شاہ ابدالی بھی لٹیرے قرار پائیں گے اور پھر عجب نہیں کہ کوئی مسخرہ "ابلیس" اور "جنات" کو اپنا ہیرو قرار دے کر حضرت آدم علیہ السلام ہی کو لٹیرا کہہ ڈالے۔ و نعوذ باللہ العلی العظیم۔

عوام میں اس قسم کے گھناؤنے خیالات کے پیدا ہونے کا ایک تیسرا اہم سبب وہ جھنجلاہٹ بھی ہے جو بعض جائز شکایات سے پیدا ہوئی ہے، پاکستان کے ہر خطے کی طرح (سابق) سندھ

کے کچھ مسائل بھی ہیں، اور عین ممکن ہے کہ ان کے مسائل دوسرے خطوں کی بہ نسبت زیادہ ہوں، حکومت کا فرض ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے اپنی تمام ممکنہ توانائیاں صرف کرے، اس مقصد کے لئے ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھائے اور کم از کم ان لوگوں کو مطمئن کر دے جو صرف جائز شکایات کی بناء پر "جئے سندھ" کی تحریک میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔

لیکن ہم آخر میں پھر وہی بات دہرائیں گے کہ اس خطے کی مشکلات اور مسائل اپنی جگہ پوری توجہ کے مستحق سہی، مگر ان کی بنیاد پر عصبیت کے شرانگیز نعرے بلند کرنا کبھی ان مسائل کو حل نہیں کر سکتا، اس سے بات سلجھنے کے بجائے اور الجھے گی، اور اس کے نتائج پوری ملت کے لئے نہایت مہلک ہوں گے ــــــــــ

و ما علینا الا البلاغ

صوبائی عصبیت، اسباب اور علاج

اسلام کی تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی بیرونی طاقتوں نے مسلمانوں کی قوت کو پارہ پارہ کرنا چاہا ہے، ہمیشہ اس کے لئے مسلمانوں کے درمیان صوبائی اور لسانی تعصبات کو ہوا دی ہے اور ان میں نسل و رنگ کے فتنے جگائے ہیں۔ ہمیں حال ہی میں اپنی زندگی کے جس عظیم ترین المیہ ـــــ سقوط مشرقی پاکستان ـــــ سے دو چار ہونا پڑا اس میں بھی ہمارے دشمنوں نے ہم پر یہی حربہ آزمایا جو اپنوں کی غداریوں، حماقتوں اور غفلتوں کی وجہ سے ہمارے ملی وجود پر کاری ضرب لگا گیا۔ کہاں وہ پاکستانی قوم تھی جو ۱۹۴۷ء میں پورے عالم اسلام کو متحد کرنے کا علم لے کر چلی تھی، اور کہاں یہ پاکستانی قوم ہے جو آج خود ٹکڑوں میں بٹ کر اپنی ذلت و نکبت کا رونا رو رہی ہے؟

ہمارے دشمن سمجھتے ہیں کہ (خاکم بدہن) یہ اس ملت کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا بہترین موقع ہے، اور اس کے اجتماعی وجود پر دو ایک ضربیں اور لگ جائیں تو اس ملت سے ہمیشہ کے لئے نجات مل سکتی ہے جو کبھی ہمارے عزائم کے لئے خطرہ بن سکتی تھی۔ اس لئے وہ رہے سہے پاکستان میں پھر وہی نسخہ آزما رہے ہیں جس نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا کر ہندوؤں کے ہاتھ رہن رکھ دیا ہے۔ اب پاکستان کے باقی ماندہ چار صوبوں میں بھی اسی صوبائی عصبیت اور لسانی منافرت کو بھڑکایا جا رہا ہے، اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

مسلمانوں کو کھلم کھلا تعصب کے نام پر اپنے مقاصد کے لئے آلہ کار بنانا بہت مشکل ہے اس لئے دشمنوں کا طریق کار ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن سے ایک طبقے کو دوسرے کے خلاف کھڑا کیا جا سکے۔ خود ہی ایک طبقے سے دوسرے پر ظلم کراتے ہیں، اور پھر خود ہی مظلوم کو اپنے حقوق کے نام پر ظلم کے خلاف صف آراء کر

دیتے ہیں۔ اور جب منافرت کی یہ آگ ایک مرتبہ بھڑک اٹھتی ہے تو اس کے بعد اس پر قابو پانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں بھی یہی طریق کار اختیار کیا گیا ہے، آج ہمیں مختلف صوبوں میں عصبیت کا جو رجحان پھلتا پھولتا نظر آ رہا ہے وہ اس خطے کے عوام کا اصلی اور فطری جذبہ ہرگز نہیں ہے، قیام پاکستان کے وقت دنیا کھلی آنکھوں دیکھ چکی ہے کہ یہاں کے عوام نے مہاجرین کا کس کشادہ دلی، خندہ پیشانی اور اخوت کے ساتھ استقبال کیا تھا۔ عرصہ دراز تک باہمی محبت کی یہ فضا انتہائی خوش گوار انداز میں قائم رہی، مختلف خطوں کے مسلمانوں میں باہم رشتے ناطے ہوئے اور مقامی و غیر مقامی کا کوئی جھگڑا کبھی کھڑا نہیں ہوا۔

لیکن جن پاکستان دشمن طاقتوں کی نظر میں مسلمانوں کی یہ وحدت کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی، انہوں نے برسراقتدار عناصر سے پے در پے ایسے کام کرائے جن سے ایک طبقہ اپنے آپ کو مظلوم محسوس کرنے لگا۔ کسی صوبے کو اعلیٰ سرکاری اور فوجی ملازمتوں سے محروم رکھا گیا، کسی علاقے کی ساری بڑی بڑی جاگیریں دوسرے علاقے کے متمول افراد پر تقسیم کر دی گئیں جب کہ مقامی آبادی کا ایک بڑا حصہ نان جویں کو ترستا رہا، کسی خطے پر دوسرے علاقے کے ایسے متعصب حکام مسلط کر دیئے گئے جنہوں نے مقامی آبادی کے ساتھ اچھوت کا سا معاملہ کیا۔ غرض جب ایک طبقے میں مظلومیت کا احساس ابھرنے لگا تو ان ہی مفسد عناصر نے جو درحقیقت اس ظلم کے ذمہ دار تھے، مقامی اور غیر مقامی کی تفریق کا نعرہ لگا کر عصبیت کی آگ بھڑکا دی اور حق و انصاف پر مبنی مطالبات میں چپکے سے نسلی اور لسانی مسائل شامل کر دیئے، اب جو تحریک سامنے آئی ہے اس میں نسلی اور لسانی مسائل آگے آ گئے ہیں، اور حق و انصاف کے اصل مسائل پیچھے چلے گئے ہیں۔

اب یہ عوام کی سادہ لوحی اور ہماری شامت اعمال ہے کہ عوام دشمن کی چالوں سے چوکنا رہنے کی بجائے ہر خوش آواز نعرے کے پیچھے چلنے کے عادی بن چکے ہیں، وہ یہ بات محسوس نہیں کر سکے کہ اصل لڑائی مقامی اور غیر مقامی کی نہیں تھی، انصاف اور ظلم کی تھی، بے دینی اور دیانت داری تھی، جب تک خدا کے خوف اور آخرت کی فکر سے بے نیاز حکام ہم پر مسلط رہیں گے، اس وقت تک عوام کو انصاف نہیں مل سکے گا، خواہ وہ حکام مقامی ہوں یا غیر مقامی، ظلم اور بے دینی کے لئے نہ کوئی وطن مخصوص ہے نہ زبان، ظالم اور بے دین خواہ کسی خطے کا ہو اور کوئی زبان بولتا ہو ظالم اور بے دین ہے، اور اس سے کوئی خطہ انصاف کی توقع نہیں رکھ

سکتا، لہٰذا اصل مسئلہ کسی مخصوص خطے کے باشندوں سے نہیں، بلکہ ظالموں او بے دینوں سے نجات حاصل کرنا ہے، اور اس کے بغیر ہمیں کبھی انصاف نصیب نہیں ہو سکتا۔

نام نہاد بنگلہ دیش اس وقت ایک پیکر عبرت بن کر ہمارے سامنے ہے، اب تو شاید وہ لوگ خوش ہوں گے جو بنگالی اور غیر بنگالی کے مسائل کھڑے کر کے مغربی پاکستان کو استحصال کا رونا رویا کرتے تھے، کیوں کہ اب مغربی پاکستان کا کوئی حاکم بنگال پر حکومت نہیں کر رہا لیکن کیا خالص بنگالیوں کی حکومت میں سات کروڑ عوام کو چین و سکھ مل گیا ہے؟ کیا اب ان پر کوئی ظلم کرنے والا باقی نہیں رہا؟ اس سوال کا جواب ان ہزاروں بنگالی افراد کے ہجوم سے پوچھئے جو روزانہ ڈھاکہ کے دفتر روز گار کے چکر کاٹنے کے بعد رات کو بھوکا سو جاتا ہے، اس کا جواب ان "برسرروز گار" مزدوروں سے پوچھئے جو اپنی دو تین دن کی مزدوری صرف ایک سیر چاول خریدنے پر صرف کر دیتے ہیں، اس کا جواب ان بنگالی تاجروں سے پوچھئے جو بنگال کے پورے بازار پر انڈیا کے ہندو کو قابض ہوتا دیکھتے ہیں اور اف نہیں کر سکتے، ابھی تو مکتی باہنی اور اس کے لیڈر ہندوستانی سنگینوں کے سایہ میں فروکش ہیں، جب یہ سایہ چھٹے گا، حقائق نکھریں گے اور عوام کو فریاد کرنے کی آزادی ملے گی، اس وقت یہ فیصلہ تو تاریخ ہی کرے گی کہ اہل بنگال کے لئے اعظم خان اور ▪ خان زیادہ بڑے ظالم تھے یا مکتی باہنی اور اس کے ہم نوا؟ بنگالی عوام کا استحصال باہر کے لوگوں نے زیادہ کیا تھا یا ان بنگالیوں نے جنہوں نے پورے بنگال کو ہندوستان کا غلام بنا کر اسے نصف صدی پیچھے دھکیل دیا ہے۔

بہرکیف! عرض کرنا یہ تھا کہ ظلم و ستم، بے دینی اور خدافراموشی کسی رنگ و نسل کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، میر جعفر اور میر صادق نے اسی کشتی میں سوراخ کیا جس میں ▪ خود سوار تھے. اس لئے حق و انصاف کو خطوں اور علاقوں کے پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا۔ عوام خواہ سندھی ہوں، یا پنجابی، پٹھان ہوں یا بلوچ اپنے علاقوں کے ہوں یا پرائے، سب کا اصل مسئلہ اس خدافراموش نظام سے نجات حاصل کرنا ہے جس میں ایک ظالم خدا کے خوف سے بے نیاز ہو کر اپنے زیر دستوں کا خون چوستا ہے، اور کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑتا، جس میں ظلم پر صبر کر لینا نسبتاً آسان لیکن داد رسوں سے فریاد کرنا مشکل ہے۔ جس میں حق و انصاف کے متلاشی کے لئے قدم قدم پر رکاوٹیں ہیں اور ظلم و جور کے خوگر کو اپنی خواہشات کا پیٹ بھرنے کی کھلی چھوٹ ہے، جس میں نیکی اور دیانت داری کی راہیں مسدود اور بدعنوانیوں کے دروازے چوپٹ کھلے ہیں۔ جب تک اس خدا بیزار نظام زندگی سے نجات حاصل نہ ہو، اس

وقت تک کسی بھی خطے کو سکھ چین نصیب نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا ہمارے نزدیک تمام مسائل کا پائیدار اور صحیح علاج تو یہ ہے کہ پاکستان میں صحیح معنیٰ میں اسلامی نظام قائم ہو، زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کو عملاً تسلیم کیا جائے اور حکومت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو خوف خدا اور فکر آخرت کے جذبات سے سرشار ہوں، لیکن پچھلے چوبیس سال میں عوام کو اسلام، نظریہ پاکستان اور قومی اتحاد کے نام پر جو دھوکے دیئے گئے ہیں ان کی وجہ سے آج اسلامی وحدت کے نرے وعظ سنا کر اس عصبیت کی تحریک کو ٹھنڈا کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے چونکہ ماضی میں اسلامی وحدت کا نام لے کر عوام کی حق تلفیاں کی گئی ہیں، اس لئے آج اس وحدت کے نعرے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا ہے، اور اب خلوص دل کے ساتھ بھی اس کی دعوت دی جائے تو اس کا موثر ہونا مشکل ہے۔

اب اگر حالات کو سنوارنے کا کوئی صحیح راستہ ہے تو ہمارے نزدیک وہ صرف یہ ہے کہ حکومت حالات کی نزاکت کا احساس کرے اور اپنی پوری توانائیاں، مختلف صوبوں کی بنیادی شکایات دور کرنے پر صرف کر دے، اپنے عمل سے ہر خطے کے عوام کو یہ یقین دلا دے کہ ان کے ساتھ ہر معاملہ میں منصفانہ اور مساوی سلوک کیا جائے گا۔ ایسے حکام کو برطرف کر دے، جو کسی علاقے میں وہاں کے عوام پر ظلم ڈھا کر نسلی منافرت پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں اور سب سے آخر میں ان سیاسی لیڈروں کو قرار واقعی سزا دے جو اس موقع پر نسلی عصبیت کی آگ بھڑکا کر اپنی سیاست کی دوکان سجا رہے ہیں۔

جب تک عوام کی بنیادی شکایات کا ازالہ کر کے انہیں عدل و انصاف کا یقین نہیں دلایا جائے گا،اس وقت تک مفسد عناصر حقوق کے نام پر تعصب کے جذبات کو ہوا دیتے رہیں گے اور یہ چیز بالآخر ملک و ملت کی تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔

ایک اور کام عام مسلمانوں کے کرنے کا ہے، اور وہ یہ کہ جہاں جہاں عصبیت کی تحریک اپنے پر پرزے نکال رہی ہے، وہاں خطے کے بااثر، سنجیدہ اور درد مند اصحاب علاقے کے نئے اور پرانے دونوں قسم کے باشندوں پر مشتمل ایسی کمیٹیاں بنائیں جو مثبت طور پر باہمی اخوت و محبت، یکجہتی اور تعاون کی فضا پیدا کریں، مثلاً مفسد عناصر نے صوبہ سندھ میں بلاوجہ سندھی اور مہاجر کا جھگڑا کھڑا کیا ہوا ہے، اور دونوں طرف بعض سیاسی لیڈر ہیں جو اس جھگڑے کو ہوا دے رہے ہیں، اب صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک جماعت جو نئے اور پرانے

دونوں قسم کے سندھیوں پر مشتمل ہو، مثبت طور پر باہمی تعاون اور اخوت کا مظاہرہ کرے۔
قدیم سندھیوں کے ساتھ جو ناانصافیاں ہوئی ہیں ان کی تلافی کے لئے جدید سندھی افراد تحریک چلائیں، اور جدید سندھیوں کو جو شکایات ہیں، انہیں دور کرنے کا مطالبہ قدیم سندھیوں کی طرف سے اٹھے اور اس طرح عملی طور پر اس بات کا ثبوت فراہم کیا جائے کہ تمام باشندے ایک دوسرے کے دکھ درد میں پوری طرح شریک ہیں اور ایک دوسرے کے مسائل کا خاطر خواہ احساس رکھتے ہیں۔

اس طریقے سے امید ہے کہ انشاء اللہ پھر وہی اخوت و محبت اور تعاون و یکجہتی کی فضا لوٹ سکتی ہے جس کا دلکش نظارہ قیام پاکستان کے وقت ہوا تھا۔

اور اگر خدانخواستہ عصبیت کے موجودہ رجحانات کو اسی طرح پھلنے پھولنے کا موقع دیا گیا اور اس کے انسداد کے لئے پوری سوجھ بوجھ، معاملہ فہمی اور دردمندی و دل سوزی کا مظاہرہ نہ کیا گیا تو اللہ وہ دن نہ دکھائے جب رہے سہے پاکستان کے چپے چپے پر بنگلہ دیش کی داستانیں دہرائی جائیں اور یہ ملک جو ہزار قربانیوں کے بعد وجود میں آیا تھا، تاریخ کا صرف ایک مختصر باب بن کر رہ جائے۔

لاقدرہ اللہ

سقوط ڈھاکہ

اور

دو قومی نظریہ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کسی قوم کی شامت اعمال کا نتہائی درجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی عبرتناک سانحہ سے دو چار ہونے کے بعد اس سے صحیح سبق لینے کے بجائے الٹی سمت میں سوچنا شروع کر دے، جو چیز اس کی تباہی کا سبب بنی ہے اسے اپنے لئے ذریعہ نجات سمجھے اور جس کام سے اس کی فلاح و بہبود وابستہ ہے، اسے اپنی بربادی کا سبب قرار دے۔ دنیا کی ہر قوم کی زندگی میں نشیب و فراز آیا ہی کرتے ہیں، فتح کے ساتھ شکست اور ذلت کا منہ بھی دیکھنا پڑتا ہے، بڑے بڑے حادثے بھی پیش آ جاتے ہیں، مصائب کے پہاڑ بھی ٹوٹ پڑتے ہیں، لیکن اگر سوچنے کا رخ صحیح اور چلنے کی سمت درست ہو تو قومیں ان تمام مشکلات کو عبور کر کے ایک نہ ایک دن منزل مقصود پر پہنچ ہی جاتی ہیں، البتہ اس قوم کی کامیابی و کامرانی کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی جس کے تباہ و برباد ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی مت بھی الٹی ہو گئی ہو۔

سقوط مشرقی پاکستان کا سانحہ ہمارے لئے ایک ایسا ہی عبرتناک سانحہ ہے، اور کوئی شک نہیں کہ ہماری ملت میں ایسے افراد کی کمی نہیں ہے جو اس حادثے کو بصیرت کی آنکھوں سے دیکھ کر اس سے صحیح سبق لے رہے ہیں۔ لیکن جن فکری اور عملی رہنماؤں کے ہاتھ میں اس وقت قوم کی باگ ڈور ہے، ان کے سوچنے کا انداز تشویش ناک حد تک غلط نظر آتا ہے، ادھر دنیا کی جو قوتیں رہے سہے پاکستان کو بھی بالکل تباہ کر ڈالنے کی خواہش مند ہیں، وہ بھی ہمارے درمیان ایسے خیالات پھیلانے میں مصروف ہیں جو ہمیں عبرت کے سیدھے راستے سے بھٹکا کر

اس سمت میں لے جائیں جہاں مکمل تباہی ہمارا انتظار کر رہی ہے۔
مشرقی پاکستان کے حادثے کے بعد طرح طرح کی بے بنیاد باتیں جو انتہائی شد و مد کے ساتھ پھیلائی جا رہی ہیں، اور بعض بڑے بڑے لیڈر، اونچے درجے کے اہل قلم اور چوٹی کے اہل فکر ہیں کہ ان خطرناک خیالات کے پرچار میں لگے ہوئے ہیں، یا ان سے متاثر و مرعوب نظر آتے ہیں، آج کی نشست میں ہم ان چند خیالات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں تاکہ حقیقت پسند حضرات اس پروپیگنڈے سے فریب نہ کھا سکیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا خیال تو یہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ مشرقی پاکستان کے حادثہ سے وہ دو قومی نظریہ غلط ثابت ہو گیا ہے جس کی بنیاد پر پاکستان کی تعمیر ہوئی تھی، یہ خیال اصل میں تو بھارت کا اٹھایا ہوا ہے، اور بھارت کی وزیراعظم اور وزیر دفاع وغیرہ نے اپنی ہر تقریر میں اسے رٹنے کی قسم کھا رکھی ہے، لیکن ہماری شامت اعمال یہ ہے کہ خود پاکستان کے بعض صوبائیت پرست لیڈروں نے بھی اب کھلم کھلا اس کی تشہیر شروع کر دی ہے، اور علی الاعلان یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ مغربی پاکستان میں بھی ایک نہیں، چار مختلف قومیں آباد ہیں۔
یہاں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے سقوط سے دو قومی نظریہ آخر کس طرح غلط ثابت ہو گیا؟ کیا محض اس لئے کہ چند غداروں کی خود غرضی نے وہاں ہماری افواج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا؟ یا اس لئے کہ وہاں بھارت نے روسی اسلحہ کے زور پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے؟ یا اس لئے کہ وہاں بھارت نے سنگینوں کے سائے میں ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کر لی ہے؟ آخر عقل و دانش کا وہ کون سا فلسفہ ہے جو یہ باور کر سکتا ہو کہ باطل کے ہاتھ میں بندوق آ جائے تو وہ حق بن جاتا ہے؟ یا سنگین کی نوک سے سچے نظریات کی تردید کی جا سکتی ہے؟ سوال یہ ہے کہ اگر اس فوجی تسلط کی وجہ سے یہ جھوٹ سچ بن گیا ہے کہ بنگالی خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، ایک قوم ہیں، تو پھر مسز اندرا گاندھی مغربی بنگال کا پورا علاقہ شیخ مجیب الرحمٰن کے حوالے کیوں نہیں کر دیتیں جو بقول ان کے بنگالی قوم کے ان داتا کی حیثیت رکھتے ہیں؟ اس واقعہ کے بعد ان کے لئے مشرقی بنگال اور مغربی بنگال کی تفریق کا آخر کیا جواز باقی رہ گیا ہے؟
واقعہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے سانحہ سے دو قومی نظریہ دلائل کے اعتبار سے کمزور نہیں، اور زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ جس شخص کو بھی مشرقی پاکستان کے حالات کا علم ہے وہ اس حقیقت

سے انکار نہیں کر سکتا کہ پاکستان سے اس خطے کی علیحدگی دو قومی نظریہ پر عمل کرنے کی وجہ سے نہیں، اسے مسلسل نظر انداز کرنے کی وجہ سے عمل میں آئی ہے۔ مشرقی پاکستان کی آبادی کا پانچواں حصہ ہندوؤں پر مشتمل تھا اور دو قومی نظریہ کا تقاضا یہ تھا کہ انہیں ایک الگ قوم قرار دے کر وہاں مخلوط کے بجائے جداگانہ انتخاب کے طریقے پر عمل کیا جاتا اور اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو مشرقی پاکستان کے حالات آج سے کہیں مختلف ہوتے لیکن ہندوؤں کی سازش نے اس واضح حقیقت کو پس پشت ڈال کر مخلوط انتخاب کا طریقہ جاری کروا دیا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی پاکستان کے بعض مسلمان لیڈر بیس فیصد اقلیت کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ گئے۔ یہاں تک کہ اس خطے کے ہندو باشندے وہاں کی سیاسی سرگرمیوں پر چھا گئے اور انہوں نے عوامی لیگ کے رہنماؤں کو اپنے ملک دشمن مقاصد کے لئے آزادی کے ساتھ استعمال کیا اور بالآخر اس پورے خطے کو بھارت کا غلام بنا کر رکھ دیا۔

یہ درست ہے کہ شیخ مجیب الرحمان ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے تھے، لیکن انہوں نے بنگلہ دیش کی آزادی کے پروگرام پر نہیں بلکہ آزادی کے عزائم کی تردید کر کر کے ووٹ حاصل کئے تھے پھر مارچ میں جس نام نہاد مکتی باہنی نے علیحدگی کی مسلح تحریک شروع کی، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی، اور مشرقی پاکستان کے عام مسلمان اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے؟ آج جب کہ متحدہ پاکستان کے حامیوں کو سنگینوں میں پرو یا جا رہا ہے، اور ان کے سروں پر بھارتی افواج کی تلوار لٹک رہی ہے، ہندوستان کے ایجنٹ ان بیکس مسلمانوں سے جو چاہیں کہلوا سکتے ہیں، لیکن اگر انہیں اپنے قلبی جذبات کے اظہار کا آزادانہ موقع ملے تو ان کی بھاری اکثریت آج بھی پاکستان کے ساتھ الحاق کی حامی ہے۔ انہوں نے اپنے پامال شدہ حقوق کی بحالی کا مطالبہ ضرور کیا تھا، لیکن اگر انہیں یہ معلوم ہوتا کہ اس جائز مطالبے سے فائدہ اٹھا کر بھارت ان پر غلامی کا شکنجہ کس دے گا تو وہ ہزار بار اس تحریک پر لعنت بھیجتے جو انہیں اندرا گاندھی، مانک شاہ اور جنرل اروڑا کا غلام بنانے کے لئے چلی تھی۔

اگر تھوڑی دیر کے لئے اس جھوٹ کو سچ فرض کر لیا جائے کہ مشرقی پاکستان کے سارے عوام پاکستان سے علیحدگی کے حامی تھے، تب بھی اس واقعے سے دو قومی نظریہ کی تردید کا آخر کیا تعلق ہے؟ اس سے بجا طور پر اگر کوئی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے تو یہ ہے کہ پاکستان کے جن صوبوں کو اپنے حقوق کی پامالی کا شکوہ ہو، انہیں اپنے حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد ضرور

کرنی چاہئے، لیکن حقوق کی اس جدوجہد کو علیحدگی کی تحریک میں تبدیل کرنے کا نتیجہ بالآخر یہ ہو کر رہے گا کہ وہ صوبہ بھارت کا بے داموں غلام بن کر رہ جائے، کیا کوئی باہوش انسان اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ آج نام نہاد بنگلہ دیش آزادی کے نام پر اس بھارتی حکومت کے ہاتھوں رہن رکھا جا چکا ہے جو اسے دریائے گنگا کا پانی دینے کے لئے بھی تیار نہیں ہے اور جو آج سے چوبیس سال پہلے تک مسلم بنگال کا خون چوستی رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دو قومی نظریہ جتنا سچا آج سے چوبیس سال پہلے تھا۔ اتنا ہی سچا آج بھی ہے، کسی سچے نظریہ کے علمبردار اپنی بداعمالیوں، آپس کے اختلافات اور اندرونی غداریوں کی بناء پر فوجی شکست کھا جائیں تو اس سے نظریہ کی حقانیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ مسلمان اور ہندو آج بھی دو الگ الگ قومیں ہیں، دونوں کے مقاصد حیات، طرز زندگی اور مزاج و مذاق میں آج بھی زمین و آسمان کا تفاوت ہے، اور مسلمان قوم اپنی مرضی سے ہندوؤں کے ساتھ مشترک حکومت کو آج بھی قبول نہیں کر سکتی۔

جو لوگ مشرقی پاکستان کے حادثے کے بعد دوسرے صوبوں میں بھی علیحدگی کی باتیں پھیلا رہے ہیں، آج قوم کو انہیں اچھی طرح پہچان لینا چاہئے اگر ہمارے عوام مشرقی پاکستان کے انجام بد سے سبق حاصل کرنے کے بجائے ان لوگوں کے ہاتھوں گمراہ ہوئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسی ہولناک اور مکمل تباہی برصغیر کے مسلمانوں کا مقدر بن چکی ہے جس کے بعد ان کے دوبارہ پنپنے کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔

اس سلسلے میں حکومت کے کرنے کا اولین کام یہ ہے کہ وہ مختلف صوبوں کی جائز شکایات کو پوری طرح رفع کرنے کا فوری انتظام کرے اور اس سلسلے میں ماضی میں جو غلطیاں ہوئی ہیں ان کا کھلے دل کے ساتھ اعتراف کر کے پورے ملک میں ایک ایسا نظام حکومت نافذ کرے جس میں تمام صوبوں کے ساتھ مساوی اور منصفانہ سلوک کیا گیا ہو، تاکہ ملک دشمن عناصر عوام کی جائز شکایات کو بہانہ بنا کر اپنے مذموم مقاصد حاصل نہ کر سکیں۔

لوگ مشرقی پاکستان کے حادثہ کے بعد اس شیطانی پروپیگنڈے میں بھی مصروف ہیں کہ معاذ اللہ ہمیں یہ شکست اس لئے ہوئی کہ ہم نے اپنے ملک کی تعمیر مذہب کے نام پر کی تھی، اور پاکستان کی تاریخ میں شاید یہ پہلا موقعہ ہے کہ اس ناپاک خیال کا اظہار اس طرح کھلم کھلا اور علانیہ طور سے کیا گیا ہے، ہم اس شیطانی وسوسہ اندازی پر کوئی مدلل تبصرہ کرنا علم، عقل اور شرافت کی توہین سمجھتے ہیں، یہ پروپیگنڈا کرنے والے وہی لوگ ہیں جنہوں نے چوبیس سال

کی مدت میں ہر مرحلے پر اسلام کے عملی نفاذ کا راستہ روکا ہے، جنہوں نے اس ملک میں ایک دن کے لئے بھی اسلامی نظام کو بروئے کار آنے نہیں دیا، جنہوں نے صوبائی تعصب کے مہلک جراثیم پھیلائے، جنہوں نے خوف خدا اور فکر آخرت کا بیج مارنے کی کوشش کی، اور آج جب کہ ملت اسلام سے روگردانی کا خمیازہ بھگت رہی ہے، یہ ملک کی تباہی کو اسلام کے سر تھوپنے کی کوشش کر رہے ہیں، جس پر یہاں ایک دن عمل نہیں ہوا۔

یہ عجیب و غریب فلسفہ ہے کہ زندگی بھر اسلام سے بغاوت پر کمر باندھے رکھو، اس کی راہ میں قدم قدم پر روڑے اٹکاؤ، شراب و کباب کی محفلیں آراستہ کرو، رقص و سرود کے ہنگاموں کو گھر گھر پھیلاؤ، فحاشی و عریانی کو فروغ دے کر قوم کو آبرو باختہ بنا ڈالو، بے پردگی اور آوارگی کو تہذیب کی علامت بنا کر عفت و عصمت کا ایک ایک نشان فنا کر دو، دفتروں میں رشوت ستانی، کام چوری اور بدنظمی کو شیر مادر سمجھ لو، بازاروں پر دھوکہ فریب، ملاوٹ، چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی کی لعنتیں برساؤ تعلیم گاہوں میں کھلم کھلا خدا بیزاری کی فضا پیدا کرو، مسجدوں کو ویران کر کے نائٹ کلبوں کی رونق بڑھاؤ، محنت اور جفاکشی کو خیرباد کہہ کر عیش پرستی کو اپنا قومی شعار قرار دو، غریبوں کو ان کا حق دینے کے بجائے ان کے جسم سے خون کی ایک ایک بوند نچوڑو، اتحاد اور یکجہتی کے بجائے صوبائی تعصب کے فتنے جگا کر ملکی سالمیت پر ہتھوڑے چلاؤ۔ اور پھر جب ان تمام حرکتوں کے نتیجے میں شکست اور ذلت عذاب نازل ہو تو یہ کہہ کر فارغ ہو جاؤ کہ اسلام نے ہمارے ساتھ کوئی وفا نہیں کی،

اللہ کے فضل و کرم سے ہم میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اس شکست اور ذلت کو اپنی بداعمالیوں کا ثمرہ قرار دیتے ہیں، لیکن بعض صحافیوں اور ادیبوں نے اس زمانے میں یہ پروپیگنڈا کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ اس شکست کا ہماری مذہبی بداعمالیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کی دلیل میں عجیب و غریب بات پیش کی جا رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر ہم میں شراب نوشی، فحاشی اور عریانی رواج پا گئی تھی تو بھارتی افواج بھی تو فرشتہ نہیں تھی، یہ ساری بداعمالیاں ان میں تو ہم سے زیادہ پائی جاتی تھیں، پھر انہیں کیوں شکست نہیں ہوئی؟

لیکن یہ "دلیل" کھجور کے درخت کو کنوئیں پر قیاس کرنے کے مرادف ہے، دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ جس طرح کافر اور مومن دونوں قوموں کے درمیان فکری اور عملی اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے، اسی طرح قدرت کا معاملہ بھی دونوں کے ساتھ بالکل علیحدہ رہا ہے، کافر

قومیں، شراب و کباب کی محفلیں سجا کر اور خدا کو فراموش کر کے دنیا کی چند روزہ زندگی میں مزے اڑا سکتی ہیں، لیکن جس قوم کا خمیر ہی اللہ اور رسول ؐ کے نام پر اٹھا ہے، جس نے زندگی کے ہر شعبے میں اللہ کی اطاعت کا عہد کیا ہے اور جسے اپنے ظاہری وسائل سے کہیں زیادہ اللہ کی نصرت و تائید پر بھروسہ ہے، اس کو اسلامی احکام سے روگردانی کر کے ذلت و خواری کے سوا کچھ نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس قوم کے ساتھ اللہ کا معاملہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ جس طرح اطاعت خداوندی کی صورت میں اسے قلیل وسائل کے باوجود بڑی بڑی طاقتوں پر فتح و کامرانی کا انعام دے دیا جاتا ہے، اسی طرح نافرمانی کی صورت میں اسے وسائل کی فراوانی کے باوجود بعض ذلیل و حقیر دشمنوں سے پٹوا بھی دیا جاتا ہے۔

اسلام کے دائرے سے باہر نکل کر آپ فسق و فجور اور نیکی و تقویٰ کو جنگی معاملات میں ایک غیر متعلق چیز قرار دے سکتے ہیں، لیکن جب تک آپ اسلام کے دائرے میں ہیں اس وقت تک آپ کے ان مذہبی اعمال و افعال کا فتح و شکست سے اتنا ہی گہرا تعلق ہے جتنا مادی وسائل اور اسلحہ و اسباب کا۔

ہاں یہ درست ہے کہ ہمیں جس بدعملی کی سزا ملی ہے اس میں دوسرے فسق و فجور کے علاوہ ہماری یہ بدعملی بھی داخل ہے کہ ہم نے اپنے دشمن کے مقابلے کے لئے کماحقہ تیاری نہیں کی، چوبیس سال کی مدت میں ہمارے بچے بچے کو سپاہی بن جانا چاہئے تھا، لیکن ہم نے اپنی نسلوں کو ہتھیاروں کے بجائے سازو سرود کا خوگر بنایا اور ملک کو مستحکم بنانے کے بجائے اقتدار کی رسہ کشی میں مبتلا رہے، لیکن یہ بات خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ اگر آپ سائنسی ترقی کے بام عروج پر پہنچ جائیں، اپنے یہاں، اسلحہ، بم اور میزائل ہی نہیں ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بھی بنالیں، اپنی فضائی اور بحری قوت کو آج سے دس گنا زیادہ مستحکم کر لیں، لیکن اسلام کے دوسرے احکام کو قطعی خیرباد کہہ کر یہاں سے اسلامی اعمال و اخلاق کا نام و نشان تک مٹا دیں، تب بھی پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کو پھر بھی ذلت اور شکست ہی کا منہ دیکھنا پڑے گا اس لئے اس شکست کے نتیجے میں جتنی ضرورت جدید ترین ہتھیاروں کی فراہمی، افواج کی تنظیم نو اور دوسرے مادی وسائل و اسباب کی تلاش کی ہے، اتنی ہی ضرورت اپنی بداعمالیوں کو ختم کر کے خالصۃً اللہ کی طرف رجوع کرنے کی بھی ہے اور جو شخص اس نازک مرحلے پر اس دوسری چیز کو قطعی غیر متعلق قرار دے کر اسے ذہنوں سے محو کرنا چاہتا ہے، وہ قوم کو اسی الٹی سمت میں لے جا رہا ہے جہاں اسے تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں مل سکتا۔

عوامی وفود حکومت کے ذمہ داروں کے پاس پہنچیں اور انہیں اس سنگین صورت حال کے خلاف اپنے جذبات سے آگاہ کریں۔ نشر و اشاعت کے ذرائع ہر معاملے میں حکومت کی پالیسی کا رخ دیکھتے ہیں۔ اور اس کے مطابق اپنے عمل کا ڈھانچہ تیار کرتے ہیں۔ موجودہ بے لگامی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ان کو اس بات کا یقین ہے کہ حکومت اس قسم کے اقدامات کو نا پسند نہیں کرتی اس کے برخلاف اگر انہیں یہ احساس دلایا جائے کہ فحاشی و عریانی کا یہ انداز حکومت کی پالیسی کے خلاف ہے تو اس بے لگام ذہنیت میں ضرور کمی آئے گی۔

حزب اقتدار اور حزب اختلاف دونوں کے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان سے ملاقات کر کے انہیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ "انسداد فواحش" کے لئے ایک جامع قانون اسمبلی کے ذریعہ منظور کرائیں جس کے ذریعہ ملک بھر میں عریانی و فحاشی کے تمام اقدامات پر پابندی لگائی جا سکے۔

عوام میں اس بات کی تحریک چلائی جائے کہ وہ ٹیلی ویژن کے ایسے پروگراموں کا قطعی بائیکاٹ کریں گے جو شرم و حیا کی روایات کے خلاف ہیں۔

یہ کام ایک دو روز میں پورا ہو جانے والا نہیں ہے۔ اس کے لئے مسلسل جدوجہد، متواتر عمل اور مستقل سوچ بچار کی ضرورت ہے جب تک کوئی معین جماعت اس کام کے لئے کھڑی نہیں ہو گی۔ اس وقت تک اس کی اہمیت محسوس کرنے والے حضرات بھی اسے آج سے کل اور کل سے پرسوں پر ٹلاتے رہیں گے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ جو جماعت یا انجمن یہ کام لے کر اٹھے اس پر کوئی سیاسی چھاپ نہ ہو اس میں ہر شعبہ زندگی کے افراد شامل ہوں، اور وہ صرف اس محدود کام کو اپنا محور و مقصد بنا کر سرگرم ہوں۔ کام شروع کرنے کے بعد اسے خود اس کے نئے نئے راستے نظر آئیں گے اور دل میں اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا شوق، اسلام کے لئے خلوص اور ملت کا سچا درد ہو تو ایسی کوشش رائیگاں نہیں جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ کچھ حساس دلوں میں اس کام کی اہمیت پیدا فرما دے اور وہ وقت کی اس اہم ضرورت کو پورا کر سکیں۔ اگر کسی صاحب دل کے سینے میں ان عاجزانہ گزارشات سے حرکت پیدا ہو اور وہ اس سلسلہ میں کوئی کام کرنے کا ارادہ کریں تو وہ مشورے کے لئے احقر کو بھی مطلع فرما دیں تو ممنون ہوں گا۔

وما توفیقی الا باللہ

عالم اسلام کے مسائل

ایران کا ڈھائی ہزار سالہ جشن

خوگر مدح سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے!

ایران ہمارا عزیز ترین ہمسایہ ملک ہے، قیام پاکستان سے لے کر اب تک پاکستان اور ایران کی دوستی مثالی طور پر بے غبار رہی ہے، اور دونوں ملکوں نے ایسی اخوت، ہمدردی، باہمی تعاون اور یک جہتی کے چھبیس سال گزارے ہیں کہ وہ بہت سوں کے لئے قابل رشک ہے اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں ملکوں کے عوام ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھتے اور ہمیشہ ایک دوسرے کی فلاح و بہبود کے خواہاں رہتے ہیں، ہمیں ایران کی ترقی و خوش حالی، سالمیت اور استحکام کی ایسی ہی آرزو ہے جیسے پاکستان کی سالمیت و استحکام کی۔ ایرانی عوام کی خوشی ہمیں اپنی خوشی محسوس ہوتی ہے اور ان کے رنج اور تکلیف کو ہم خود اپنے دل کا کانٹا سمجھتے ہیں۔

اخوت و محبت کا یہ تعلق درحقیقت کسی جغرافیائی اتفاق کا کرشمہ نہیں، بلکہ اس کی بنیاد توحید، رسالت اور آخرت کے ان مضبوط عقائد پر استوار ہے جنہوں نے مشرق و مغرب کے انسانوں کو عقیدے کی ایک مستحکم لڑی میں پرو رکھا ہے، جب تک دونوں ملکوں میں اس عقیدے کی حکمرانی ہے اس وقت تک انشاء اللہ دونوں جگہ کے عوام کو دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی اور یہ صرف پاکستان اور ایران ہی کا معاملہ نہیں، دنیا کے تمام اسلامی ممالک کے لئے پاکستانی عوام کے یہی جذبات ہیں۔

اسلامی ممالک کی باہمی دوستی چونکہ اسلام کے مضبوط عقیدے پر استوار ہے، اس لئے یہ محض ایک رسمی، ظاہری اور مصنوعی محبت نہیں، یہ وہ حقیقی اور فطری محبت ہے جس کی جڑیں دل کی گہرائیوں تک اتری ہوئی ہیں، اور جس کے ذرے ذرے سینے کی دھڑکنوں میں سرایت کر گئے ہیں۔

ایسی دوستی ظاہری رسموں، بناوٹی باتوں اور دکھاوے کی قائل نہیں ہوتی، اس کے کچھ اپنے تقاضے اور اپنے ادب و آداب ہیں اور اس کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ اگر اپنے بھائی کی کوئی بات غلط محسوس ہو تو اس کا کھل کر اظہار کیا جائے، اور اسے کسی مرحلے پر لگاوٹ اور نفاق سے آلودہ نہ ہونے دیا جائے۔

دوستی کے اسی مقدس تقاضے کی بناء پر ہم آج ایران کے ارباب حکومت سے چند گزارشات کرنا چاہتے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ جس خیر خواہانہ جذبے سے وہ پیش کی جا رہی ہیں، اسی جذبے کے ساتھ انہیں سنا جائے گا۔

حکومت ایران نے اکتوبر کے مہینے میں اپنا ڈھائی ہزار سالہ جشن شاہی منانے کا اعلان کیا جس کی تیاریاں زور و شور کے ساتھ ہو رہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ایران کو اپنی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں دکھائے، لیکن یہ "ڈھائی ہزار سالہ جشن شاہی" ہماری فہم سے بالکل بالاتر ہے، ہم یہ نہیں سمجھ سکے کہ چودہ سو سال پہلے کے ایران سے آج کے ایران کا کیا تعلق ہے؟ وہ آخر کون سا رابطہ ہے جس کی بناء پر آج کا ایران جو اللہ کی توحید اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتا ہے دو ہزار سال پہلے فارس کی تاریخ کو اپنی تاریخ میں مدغم کر رہا ہے؟

ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے اس خطہ زمین میں حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت خالد بن عرفطہ، اور ان کے جانباز ساتھیوں نے جو حسین انقلاب برپا کیا، اس نے ایران کا رابطہ دارا اور پرویز جیسے بادشاہوں سے کاٹ کر اسے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے غلاموں کے ساتھ جوڑ دیا تھا، حضرت ربعی بن عامرؓ نے کسریٰ کے سپہ سالار رستم کے دربار میں فرمایا تھا کہ "ہمیں اللہ نے اس لئے بھیجا ہے کہ ہم اس کے بندوں کو دنیا کی تنگی سے فراخی کی طرف اور دوسرے مذاہب کے ظلم و جور سے اسلام کے عدل و انصاف کی طرف نکال لے جائیں (۱)۔ اور پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ عرب کے ان صحرا نشینوں نے واقعۃً یہاں کے باشندوں کو امن و سکون، خوشحالی اور عدل و انصاف سے ہمکنار کر کے اعلیٰ و ادنیٰ کی تفریق مٹا دی۔

---

(۱) اللہ جاء بنا وھو بعثنا لنخرج من یشاء من عبادہ من ضیق الدنیا الی سعتہا ومن جور الادیان الی عدل الاسلام۔ (کامل ابن اثیر ص: ۱۷۹ ج: ۲)

یہی وجہ ہے کہ خود یہاں کے حق پرست باشندوں نے اس انقلاب کی راہ میں اپنی آنکھیں بچھائیں اور ان کے دین، ان کی معاشرت، ان کی تہذیب اور ان کے پورے نظام زندگی کو اس طرح اپنا لیا کہ وہ ایک بالکل نئی قوم بن گئی جس کا رستم، بہرام اور پرویز سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پہلے یہ قوم صرف ایک خطہ زمین تک محدود تھی اور اس کی تاریخ ایک مخصوص شاہی خانوادے کے ساتھ وابستہ تھی، اب یہ اس عالمگیر ملت کا عضو بن گئی جس کی بے پایاں وسعتوں میں مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی حدیں مفقود ہیں، اور جس کی تاریخ نبوت و رسالت کے اس نورانی سلسلے سے جاملتی ہے جس نے دنیا کو ہدایت کی روشنی سے آشنا کیا ہے۔

موجودہ ایران کو دنیا اسی عالمگیر برادری کے ایک فرد کی حیثیت سے جانتی ہے، اسی وجہ سے اس کا شمار اسلامی ممالک میں ہوتا ہے اور اسی بناء پر پورا عالم اسلام اسے اپنا عزیز بھائی تصور کرتا ہے، اور یہ اس خطے پر اللہ کا بڑا انعام واحسان ہے کہ اس کا رشتہ آگ کی پرستش کرنے والوں سے کٹ کر اس کائنات کے افضل ترین پیغمبر محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جڑ چکا ہے، لہٰذا اس خطے کے باشندوں کو کبھی یہ بات فراموش نہ کرنی چاہئے کہ آج کے ایران اور چودہ سو سال پہلے کے فارس میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اور ان دونوں کے درمیان سوائے ایک چھوٹے سے رقبہ زمین کے کوئی چیز مشترک نہیں ہے، آج کے مسلم ایران کے ہیرو دارا، کیخسرو اور رستم و سہراب نہیں، بلکہ مثنیٰ بن حارثہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، نعمان بن مقرنؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، قعقاع بن عمروؓ اور ان کے وہ جانشین ہیں جنہوں نے اس خطے کو اسلام کی روشنی سے جگمگایا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں خود غور کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ ایران میں ڈھائی ہزار سالہ شاہی کا جشن کس حد تک معقول ہے؟ اس جشن کا مطلب دنیا میں یہ سمجھا جائے گا کہ اب ایران دوبارہ اپنی عقیدت و محبت کا مرکز ان شہنشاہوں کو بنا رہا ہے جن میں سے ایک نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارکہ چاک کر ڈالا تھا اور جن کے بارے میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ:

اذا ھلک کسری فلا کسری بعدہ

جب کسریٰ ہلاک ہو گا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں ہو گا

یہ بات کتنی خطرناک، کتنی سنگین اور کتنی اضطراب انگیز ہے؟ اس کی تشریح کے لئے ہمارے

پاس الفاظ نہیں ہیں، اور اس سے مسلمانوں کی غیرت ملی جس بری طرح مجروح ہو گی اس پر سوائے اسلام دشمنوں کے کوئی خوش نہیں ہو سکتا، اور اس سے زیادہ کرب انگیز بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ یہ اقدام جس کی زد نتیجے کے اعتبار سے مسلمانوں کی قرون اولیٰ کی تاریخ پر پڑتی ہے، ایک اسلامی ملک کی سرکاری سرپرستی میں انجام دیا جائے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

دشمنان اسلام نے امت مسلمہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے سازشوں کے جو جال بچھائے ہیں ان میں سب سے زیادہ موثر اور مہلک جال وہ نظریہ قومیت ہے جو وطن اور رنگ و نسل کی بنیاد پر قوموں کی تشکیل کا قائل ہے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اس باطل نظریہ کا افسوں توڑ کر ایک ایسی ملت تیار فرمائی تھی جس میں رنگ و نسل کی کوئی تفریق نہیں تھی اور جو عالمگیر وحدت کا پیغام لے کر اٹھی تھی، اسی وحدت نے طاغوتی قوتوں کا سرکچلا اور دنیا کو ایک ایسا نظام حیات عطا کیا جس کے ذریعہ انسان امن و سکون کے ساتھ اپنی دنیا اور آخرت سنوار سکیں، اسلام کے دشمنوں کی نگاہ میں یہ عالمگیر وحدت جو رنگ و نسل کے بجائے نظریہ اور عقیدے کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی، ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی، اور انہوں نے اسے ختم کرنے کے لئے بار بار اسلامی صفوں میں رنگ و نسل کے فتنے بیدار کئے، اور تاریخ شاہد ہے کہ انہی رنگ و نسل کے فتنوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا۔

آخری دور میں مغربی افکار کا جو سیلاب اسلامی دنیا میں لڈا اس نے اس فتنے کو نیشنلزم کا عنوان دے کر ایک فیشن بنا دیا، اور جن لوگوں کے دل و دماغ نے مغربی طرز تعلیم کے زیر سایہ پرورش پائی تھی انہوں نے اس نظریہ کو لپک کر قبول کر لیا، اسی کے نتیجے میں عربی اور ترکی کا مسئلہ پیدا ہوا، اور اس نے مسلمانوں کی ایک مستحکم خلافت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا، اسلامی دنیا ان گنت چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی، اور اسلامی وحدت کا تصور دور سے دور تر ہوتا چلا گیا۔

اسلامی ممالک کے ایک دوسرے سے الگ ہو جانے کے بعد بھی، دشمنان اسلام کو یہ خطرہ ہر وقت لگا ہوا ہے کہ مبادا یہ لوگ کسی وقت ایک ہو بیٹھیں، اس لئے ہر ملک میں وطنیت کے نظریہ کو پروان چڑھانے کی بھرپور کوششوں میں مصروف ہیں، نئی مسلمان نسل کے ذہنوں سے، اسلامی وحدت کے تصور کو کھرچ کھرچ کر نکالنا چاہتے ہیں، اور اس غرض کے لئے ہر ملک کے باشندوں کا رشتہ ان کے مسلمان اسلاف کے بجائے ان کے غیر مسلم آباؤ اجداد کے ساتھ جوڑنے کی فکر میں ہیں، اور ہر اس تحریک کی پیٹھ تھپکتے ہیں جو اسلامی قومیت کی بجائے وطنی

قومیت کی بنیاد پر کھڑی ہوئی ہو۔

ان حالات میں اسلامی ممالک کے فرائض بڑے نازک ہیں، انہیں اس معاملہ میں حد درجہ احتیاط، سوجھ بوجھ اور دور اندیشی کا مظاہرہ کرنا چاہئے، انہیں ہر اس اقدام سے مکمل پرہیز کی ضرورت ہے جو انہیں کسی بھی درجہ میں مسلمانوں کے بجائے غیر مسلموں سے قریب کر سکتا ہو۔

افسوس ہے کہ ابھی تک اسلامی ممالک میں اس حقیقت کا شعور بہت ست ہے، اور متعدد اسلامی ممالک دشمنوں کی اس سازش کا شکار ہو رہے ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے مصر کے بعض لوگوں نے اپنا رشتہ فرعون کے ساتھ ملانے کی کوشش کی تھی، اور اسی کے نتیجے میں فرعون کی کئی یادگاریں قائم کی گئیں، پچھلے دنوں بعض لوگوں نے پاکستان کے صوبہ سندھ میں راجہ داہر کی قبر پر پھول چڑھا کر اس دیو استبداد سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا اور اب ایران میں یہ ڈھائی ہزار سالہ جشن شاہی منا کر کسروی حکومتوں کو خراج تحسین پیش کیا جا رہا ہے۔

خدا نخواستہ اگر اسلامی ممالک میں یہ رجحان اور آگے بڑھا تو کچھ بعید نہیں ہے کہ کسی وقت سعودی عرب کے لوگ ابو جہل اور ابو لہب کی برسی منانا شروع کر دیں، عراق کے لوگ نمرود کو اپنا ہیرو قرار دیں، شام میں قیصر روم کی یاد منائی جائے، اور یمن میں عاد و ثمود کے کھنڈر زندہ ہو جائیں۔

خدا کے لئے سوچئے کہ اس تباہ کن طرز عمل کا انجام کیا ہو گا؟ اور ہیرے بیچ کر کنکر خریدنے کا یہ طریقہ اس امت اسلامیہ کو کہاں لے جائے گا جس نے اپنا سب سے پہلا وار تعصب کے بتوں پر کیا تھا، اور جس کے سالار اعظم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قبیلے کے باطل پرستوں کے خلاف تلوار اٹھا کر فارس کے سلمانؓ، حبشہ کے بلالؓ، اور روم کے صہیب کو گلے سے لگایا تھا؟

اسلام اور امریکہ

سابق امریکی صدر نکسن کے ایک مضمون کی روشنی میں

دنیا اس وقت دو عالمی طاقتوں امریکہ اور روس کے بنائے ہوئے سیاسی جتھوں میں بٹی ہوئی ہے۔ کچھ ممالک امریکی بلاک سے وابستہ ہیں جنہیں دائیں بازو کے ممالک کہا جاتا ہے، اور کچھ روسی بلاک میں شامل ہیں اور بائیں بازو کے ممالک کہلاتے ہیں۔ اور جو ممالک اپنے آپ کو تیسری دنیا " یا غیر وابستہ " ممالک سے تعبیر کرتے ہیں، وہ بھی بیشتر ایسے ہیں کہ صرف نام ہی کی حد تک غیر جانب دار ہیں، ان کا حقیقی جھکاؤ انہی دو بلاکوں میں سے کسی ایک کی طرف ضرور ہے۔

ہمارا ملک چونکہ ابتداء ہی سے کسی حد تک امریکہ سے وابستہ رہا ہے، اس لئے یہاں امریکی پروپیگنڈہ کے اثرات بھی زیادہ ہیں۔ انہی اثرات کا ایک حصہ یہ ہے کہ یہاں کے ان حلقوں میں جو "اسلام پسند " کہلاتے ہیں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ امریکہ اسلام اور مسلمانوں سے روس کی بہ نسبت قریب ہے، لہٰذا اگر ان دو بلاؤں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا کسی وقت ناگزیر ہوجائے تو وہ امریکہ کو اختیار کر سکتے ہیں، لیکن روس کے بارے میں سوچنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے۔ یہی صورت ان دوسرے ممالک میں بھی ہے جو دائیں بازو کے ممالک کہلاتے ہیں۔

اس مجموعی تاثر کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ جو جماعتیں ان مسلم ملکوں میں "اسلامی نظام " اور "نفاذ شریعت " کی داعی ہیں، ان کا شمار عموماً دائیں بازو کی جماعتوں میں کیا جاتا ہے،

اور ان جماعتوں نے بھی "دائیں بازو" کے ساتھ اپنی وابستگی یا اس نام کے ذریعے اپنی پہچان پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ دنیا میں جہاں کہیں دائیں اور بائیں بازو کی لڑائی ہو، اس میں ان حلقوں کی ہمدردی دائیں بازو سے زیادہ وابستہ رہتی ہے، بلکہ اگر یہ لڑائی کسی مسلم ملک میں ہو رہی ہو تو اسے "اسلام اور کفر" کی جنگ قرار دینے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ جب انڈونیشیا میں بائیں بازو کی حکومت کی انقلابی جدوجہد جاری تھی تو ہمارے ملک میں تاثر کچھ اس قسم کا دیا جا رہا تھا کہ اسلام کفر کے مقابلے میں صف آراء ہے۔

یہ تاثر راقم الحروف کی رائے میں ہمیشہ سے نہایت غلط گمراہ کن ہے، اور ہم نے اس دھوکے میں آکر بہت سے نقصانات اٹھائے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی کے معاملے میں یہ دونوں طاقتیں یکساں ہیں، اور ان میں سے کوئی اسلام دشمنی میں دوسری سے کم نہیں ہے، چنانچہ امریکہ بھی اسلام اور مسلمانوں کا اتنا ہی بڑا دشمن ہے جتنا روس۔ بلکہ ان دو متحارب طاقتوں میں اگر کچھ اشتراک کے نقطے نکل سکتے ہیں تو ان میں اسلام دشمنی کا نقطہ سرفہرست ہے۔

فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ مسلمان ملکوں میں امریکہ کی کوشش ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ اسلام کے نام ـــــ اور صرف نام ـــــ کو کمیونزم کی یلغار کے لئے ڈھال کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ کہ اشتراکیت کے پاس "معاشی مساوات" اور "غریبوں کی بہبود" کا ایک ایسا نعرہ موجود ہے جو خواہ کتنا پر فریب کیوں نہ ہو، لیکن سادہ لوح عوام کو اپیل کرتا ہے، اور جو شخص بھی یہ نعرہ لے کر اٹھے، سیدھے سادے عوام کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان کے دل کی دھڑکنوں کی ترجمانی کر رہا ہے۔ لہٰذا کم تعلیم یافتہ ممالک میں اس دلفریب نعرے کا توڑ فلسفیانہ اور اعداد و شمار کی منطق کے ذریعے نہیں کیا جاسکتا۔ وہاں تو اس کے توڑ کے لئے کوئی ایسا جذباتی نعرہ چاہئے جو ایک ان پڑھ انسان کے دل میں اتر جائے اور مسلمان ملکوں میں ایسا موثر جذباتی نعرہ "اسلام" سے زیادہ کوئی نہیں ہوسکتا جس کی حقانیت اور جس کے لئے کٹ مرنے کی آرزو ہر بچے بچے کے دل میں سمائی ہوئی ہوتی ہے۔

لہٰذا امریکہ کی پالیسی ان ملکوں میں یہ ضرور رہی ہے کہ اسلام کے اس دلکش نعرہ کو اشتراکیت کے مقابلے پر کھڑا کر کے کمیونزم کی پیش قدمی کو روکا جائے۔ لیکن جہاں تک حقیقی اسلام اور اس کے نفاذ کا تعلق ہے، وہ امریکہ کو ایک لمحے کے لئے گوارا نہیں۔ چنانچہ جہاں اس کی کوششوں کا رخ یہ ہوتا ہے کہ "اسلام" کے نعرے کو فروغ ملے وہاں وہ حقیقی اسلام کا

راستہ روکنے کے لئے اس سے زیادہ اہمیت اور باریک بینی کے ساتھ کمربستہ رہتا ہے۔

جتنے مسلم ممالک میں دائیں بازو کی حکومتیں بر سراقتدار ہیں، ان سب میں صورت حال یہی ہے کہ نام کی حد تک وہ "اسلام" سے وابستگی کا اظہار کرتی رہتی ہیں، لیکن یہ وابستگی زبانی جمع خرچ، خوبصورت بیانات اور شاندار کانفرسوں کی حد تک محدود ہے۔ پاکستان کے علاوہ دیگر مسلم ملکوں میں سے اس وقت مصر، اردن، ترکی، انڈونیشیا، مراکش، غرض دائیں بازو کے جس ملک کو دیکھئے، وہاں صورت حال یہی ہے کہ اسلام صرف کانفرس ہالوں، اخباری بیانات اور علمی مقالات کی زینت ہے، لیکن جہاں تک "نفاذ شریعت" کے عملی کام کا تعلق ہے، نہ صرف یہ کہ صفر ہے، بلکہ سرکاری مشینریوں کی توانائی اس کی مخالف سمت میں خرچ ہو رہی ہے، دینی حلقے معتوب ہیں، ان پر عرصہ زندگی تنگ کیا جارہا ہے، "نفاذ شریعت" کے لئے اٹھنے والی ہر آواز کو دبانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگ رہا ہے۔ شراب نوشی فروغ پارہی ہے، نائٹ کلب آباد ہیں، عریانی و فحاشی کا بازار گرم ہے، ٹیلی ویژن اور وی سی آر کے ذریعے گھر گھر میں مغربی بد اخلاقی کا ننگا ناچ جاری ہے، اور جو کوئی ان برائیوں کے خلاف بولے، وہ یا تو گردن زدنی ہے، یا کم از کم "رجعت پسند"، "دقیانوسی"، "جنونی"، پسماندہ"، اور "بنیاد پرست" (Fundamentalist) کے طعنوں سے لہولہان ہے۔

دوسری طرف روس جب ایک عرصے تک اپنی مذہب دشمن پالیسوں کی بنا پر دنیا بھر میں بدنام ہو گیا، اور اس نے محسوس کیا کہ امریکہ نے مسلم ممالک میں اس کے آگے مذہب کی سد سکندری کھڑی کر دی ہے تو اس نے بھی پالیسی میں تبدیلی کر کے بہت سے ملکوں میں وہی امریکی ڈپلومیسی اختیار کر لی۔ اس کا نعرہ یہ تھا کہ مذہب تو در حقیقت اشتراکیت کا حریف نہیں، بلکہ اس کا حامی ہے، اور خاص طور پر اسلام تو دنیا میں (معاذ اللہ) آیا ہی اس لئے تھا کہ اشتراکیت کا قیام عمل میں لائے، اس طرح اشتراکی بلاک نے اسلام کے صرف نعرے ہی کو نہیں، بلکہ اس کی معاشی تعلیمات کو مسخ اور تحریف کر کے استعمال کرنا شروع کر دیا، چنانچہ جو مسلم ممالک بائیں بازو سے تعلیمات رکھتے ہیں، مثلاً الجزائر اور لیبیا وغیرہ، وہاں بھی اب اسلام کا نام بڑے زور و شور سے لیا جاتا ہے، بلکہ اسلام کی صحیح نمائندگی کے بلند بانگ دعوے بھی کئے جاتے ہیں، لیکن جہاں تک "حقیقی اسلام" کا تعلق ہے، وہاں بھی اتنا ہی مظلوم او ستم ظریفیوں کا شکار ہے جتنا دائیں بازو کے ممالک ہیں۔

اس لحاظ سے اگر "اسلام" سے عداوت اور اس کی راہ میں رکاوٹ بننے کے معاملے میں

پہلے امریکہ اور روس کے درمیان کوئی فرق تھا بھی، تو اب وہ بھی ختم ہو چکا ہے، اور "حقیقی اسلام" کے نفاذ کے معاملے میں دونوں کا طرز عمل ایک ہی جیسا ہے۔ اب اسلام کے نام سے دونوں میں سے کسی کو کد نہیں، دونوں اسے اپنے اپنے مقصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں، لیکن یہ بات دونوں کے ذہن میں واضح ہے کہ "حقیقی اسلام" ہم میں سے ہر ایک کی موت ہے، اور اگر کہیں "حقیقی اسلام" آگیا تو وہ ایک تیسری طاقت بن کر دونوں کا کام تمام کر دے گا۔

یہ حقیقت کہ اسلام دشمنی کے معاملے میں امریکہ اور روس دونوں ایک ہیں (اور کچھ تعجب نہیں کہ انہوں نے اس سلسلے میں مصالحت کے ذریعے بندر بانٹ بھی کر رکھی ہو) ہم عرصہ دراز سے محسوس تو کرتے تھے، اور جو حالات روزمرہ سامنے آتے رہتے ہیں، ان سے اس احساس کو تقویت بھی پہنچتی رہتی تھی، لیکن کچھ عرصہ پہلے امریکہ کی ایک نہایت ذمہ دار شخصیت نے اس حقیقت کو کھلے لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ اور یہ ذمہ دار شخصیت سابق امریکی صدر رچرڈ نکسن ہیں، جو عرصہ دراز تک امریکہ کے صدر رہے ہیں، اور ان کی سوچ کو بجا طور پر امریکہ کی مجموعی سوچ کا ترجمان کہا جاسکتا ہے۔

انہوں نے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے امریکہ سے نکلنے والے ماہنامے "فارن افیئرز" میں امریکہ اور روس کے تعلقات کے موضوع پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون کا ایک اقتباس مجھے حال ہی میں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس مضمون میں وہ لکھتے ہیں:۔

While we should hold the soviets accounnt table for thr action they take that are opposed to our inteests, we should aecognie that they are not responsible for all of the troub les in the world. The income gap between nat-ion that provice raw materials and those that consime them; famine dur to climate aures, radical muslim fund-amentalist and errorist movements emanating fron Libya and Iran all of these problems would exist even if

sovite union did not exist. But rether than exaloiting sure problous the Sovite Union should join the United States and other wetenn nations in cosgating them. The Sovite should be esplically concorned about the rise of Muslim fundamentalism, not only beacuse ane-third of the population, of the Coviet Union is Muslim, but also beacuse the Muslim revolution completes with the revolution for the sun ont of people in third world nation6. (Richard Mion; Fereign Affairs; October 19852)

"ہم (امریکی) لوگ جب سوویٹس (روسیوں) کو ان اقدامات کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں جو وہ ہمارے مفادات کے خلاف کرتے ہیں، وہاں ہمیں یہ بھی محسوس کرنا چاہئے کہ وہ دنیا میں پیدا ہونے والی تمام مشکلات کے ذمہ دار نہیں ہیں ـــــ خام مال پیدا کرنے والی قوموں اور ان کو صرف کرنے والی قوموں کے درمیان پایا جانے والا آمدنی کا تفاوت، آب و ہوا کے اسباب کے تحت پڑنے والا قحط، مسلمان بنیاد پرستوں کی انقلابی تحریک، اور دہشت گردی کی تحریک جو لیبیا اور ایران سے ابھر رہی ہے ـــــ یہ سارے مسائل ایسے ہیں کہ اگر بالفرض روس موجود نہ ہوتا تب بھی یہ مسائل موجود ہوتے۔ لیکن بجائے اس کے کہ ان مسائل کا استحصال کیا جائے روس کو چاہئے کہ وہ ان مسائل سے نبرد آزما ہونے میں ریاستہائے متحدہ امریکہ اور دوسری مغربی اقوام کے ساتھ شریک ہو جائے روسیوں کو خاص طور پر مسلم بنیاد پرستی کے ابھار پر زیادہ تشویش ہونی چاہئے، صرف اس لئے نہیں کہ روس کی ایک تہائی آبادی مسلمان ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ تیسری دنیا کے عوام کی حمایت کے معاملے میں اسلامی انقلاب اشتراکی انقلاب کا پورا حریف بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ "

یہ ہے اس "دائیں بازو" کے سربراہ اعلیٰ کا ذہن جسے روس کے مقابلے میں "اسلام سے قریب تر" سمجھا جاتا ہے۔ "مسلم پرستی" (Muslim Fundamentalism) کی اصطلاح

امریکہ ہی سے چلی ہے، اور اس کا مطلب ہے راسخ العقیدہ مسلمانوں کی تحریک نشاۃ ثانیہ، اس "مسلم بنیاد پرستی" کو امریکہ نے دنیا بھر میں بدنام کرنے اور اس لفظ کو ایک گالی بنا دینے کی باقاعدہ مہم شروع کر رکھی ہے، اور مذکورہ بالا اقتباس میں رچرڈ نکسن صاحب نے جس طرح اس لفظ کو قحط زدگی اور دہشت گردی کے ساتھ ملا کر ایک سانس میں ذکر کیا ہے، اس سے اس شدید بغض اور نفرت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جو ان لوگوں کے دل میں "حقیقی اسلام" کے خلاف موجزن ہے۔

قد بدت البغضاء من افواههم و ما تخفى صدورهم اكبر

ان لوگوں کے منہ سے بغض ظاہر ہو گیا ہے، اور جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا ہوا ہے، وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔

اور بات صرف اتنی بھی نہیں ہے کہ یہ بغض اس اقتباس میں منظر عام پر آگیا، بلکہ ساتھ ہی نکسن صاحب اپنے سب سے بڑے حریف ـــــ روس ـــــ کو بھی باقاعدہ دعوت دے رہے ہیں کہ وہ اس فتنے کے خلاف جنگ میں امریکہ کے ساتھ شریک ہوجائے، اور اسے متنبہ فرما رہے ہیں کہ روس کے لئے مسلمانوں کا خطرہ زیادہ سنگین ہے، کیونکہ روس کی ایک تہائی آبادی مسلمان ہے، اور ستم رسیدہ عوام کے لئے اسلام کے پاس ایک ایسا پرکشش نظام زندگی بھی موجود ہے جو کسی وقت اشتراکیت کو بھی مات دے سکتا ہے ـــــ نکسن صاحب کا یہ اقتباس پڑھ کر ہمیں اقبال کی مشہور نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" یاد آگئی جس میں ابلیس نے اپنے چیلوں کے سامنے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا کہ ۔۔

جانتا ہوں میں جو رنگ گردش ایام ہے
مزدکیت فتنہ فردا نہیں، اسلام ہے

بہر صورت! ہم سابق صدر امریکہ رچرڈ نکسن صاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنے اس مضمون کے ذریعے ہمارے اس احساس کی کھلے الفاظ میں تصدیق فرمادی کہ اسلام دشمنی میں امریکہ اور روس دونوں ایک ہیں، اور ان میں سے کسی کو بھی کسی پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔

اس کے بعد ان سادہ لوح مسلمانوں کی آنکھیں کھل جانی چاہیں جو امریکہ کو نسبتاً اسلام دوست سمجھتے ہیں۔ جنہوں نے نفاذ اسلام کی تحریک کو "دائیں بازو" کی تحریک کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے، اور جو "دائیں بازو" کے عنوان سے اپنی پہچان کرانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے

محمد تقی عثمانی

۱۴ رجب ۱۴۰۷ھ

ترکی جاگ رہا ہے

حال ہی میں امریکہ کے ایک معروف جریدہ "کرسچین سائنس مانیٹر" میں ایک یہودی نامہ نگار سام کوھن (مقیم ترکی) کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا متن پاکستان کے بعض انگریزی اخبارات و رسائل نے بھی نقل کیا ہے۔ یہ مضمون چونکہ پورے عالم اسلام کو مختلف حیثیتوں سے دعوت فکر دیتا ہے اس لئے ہم آج کی صحبت میں پہلے اس مضمون کا ترجمہ اور پھر کچھ اپنی گزارشات پیش کریں گے۔

اس مضمون کا عنوان ہے:۔

ترکی میں اسلام کا احیاء

تجدد پسندوں کو خطرہ

اس عنوان کے تحت سام کوھن لکھتا ہے کہ:۔

"ترکی کے بہت سے باشندے آج کل احیاء اسلام کی روز افزوں مہم سے پیدا ہونے والے ممکنہ نتائج کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے غورو فکر کر رہے ہیں، ... اس بات سے پریشان ہیں کہ یہ تحریک کہیں ترکی کو دو کیمپوں میں تقسیم کر کے ملک کے استحکام اور پارلیمانی جمہوریت کے لئے خطرہ نہ بن جائے۔ تجدد پسند اور آزاد خیال (Liberal) حلقے یہ محسوس کر رہے ہیں کہ جمہوریہ ترکیہ کے بانی کمال اتاترک نے چالیس سال پہلے ترکی معاشرے کو جن لادینی بنیادوں پر کھڑا کیا تھا، آج کی یہ اسلامی مہم ان کے لئے ایک خطرہ ہے، لیکن سلیمان ڈیمرل کی رجعت پسند حکومت اور ان کی حکمراں جماعت (جسٹس پارٹی) کسی خطرے کے وجود ہی سے انکار کر رہی ہے۔

جب تک ترکی میں کمال اتاترک کا راج اور ایک جماعتی نظام جاری تھا اس وقت تک اسلامی تعصب (Fanaticism) کی اس تحریک کو زبان کھولنے کا کوئی موقع نہ مل سکا، لیکن

جب ۱۹۵۰ء میں پارلیمانی جمہوریت مکمل طور پر بحال ہوئی تو رجعت پسندی کے رجحانات سطح پر آگئے۔

اس وقت ملک پر عدنان مندریس کی ڈیموکریٹک پارٹی برسراقتدار تھی جس نے رجعت پسند دیہاتی اکثریت سے ووٹ اور حمایت حاصل کرنے کے لئے "مذہبی تعصب" کو گوارا کر لیا۔ لیکن ۱۹۶۰ء کے فوجی انقلاب نے عدنان مندریس پارٹی کا تختہ الٹ دیا۔ اور ایک سال بعد عدنان مندریس کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ اب جو جماعت (جسٹس پارٹی) ترکی میں برسراقتدار ہے اسے عام طور سے (عدنان مندریس کی) ڈیموکریٹک پارٹی کا قدرتی وارث سمجھا جاتا ہے، اور آج اس پر بھی یہ الزام ہے کہ وہ بھی اسی (عدنان مندریس کی قائم کی ہوئی) راہ پر گامزن ہے۔

اتاترک کی اصلاحات پر حملے

واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ ترکی میں احیاء اسلام کی وکالت کر رہے ہیں ان کے حوصلے موجودہ حکومت کے روا دارانہ طرز عمل سے بہت بڑھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بہت سی مسجدوں کے امام (مسلمان پادری) اپنی تقریروں میں اتاترک کی اصلاحات پر حملے کرنے لگے ہیں۔ بعض لوگوں نے تو کھلم کھلا شریعت (اسلامی قانون) کو دوبارہ نافذ کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ اور دوسرے بہت سے لوگوں نے منی اسکرٹ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے عورتوں پر زور دیا ہے کہ وہ اپنے بدن اور اپنے سروں کو "خوب اچھی طرح" ڈھانک کر رکھیں۔

اس ملک میں جا بجا اتاترک کے جو مجسمے اور تصویریں نصب ہیں ان کے خلاف بھی آوازیں اٹھنے کی متعدد خبریں ملی ہیں۔ حالیہ چند مہینوں میں بہت سے رجعت پسند اخبارات اور رسائل کیڑوں مکوڑوں (MUSHROOMS) کی طرح اچانک میدان میں آ دھمکے ہیں اور ان میں سے بعض نے علی الاعلان دوبارہ مذہبی حکومت کی طرف لوٹنے کا مطالبہ کیا ہے۔

ملک میں بہت سے کٹر مذہبی تنظیموں کی سرگرمیاں بھی بڑھ رہی ہیں، یہ تنظیمیں ایسے پمفلٹ اور اشتہار تقسیم کرتی ہیں جن میں موجودہ دستور کو بدلنے اور منجملہ اور ترمیمات کے خاص طور سے "خلافت" کو بحال کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے (خلافت ملک کے روحانی قائد کا عہدہ تھا جسے ۱۹۲۴ء میں ختم کیا گیا تھا) ان تنظیموں کے بارے میں عموماً یہ سمجھا جا رہا ہے کہ وہ ہمسایہ عرب ملکوں کی اخوان المسلمین جیسی جماعتوں کی شہ پر قائم ہوئی ہیں۔

بہت سے دیہات میں مسلمان اساتذہ (جنہیں یہاں "خوجہ" کہتے ہیں) بڑی سرگرمی کے ساتھ حکومت کے لادینی اسکولوں کا مقابلہ کر رہے ہیں اصل مشکل یہ ہے کہ تمام چھوٹے علاقوں میں سرکاری اسکولوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ وہ وہاں کی ضروریات کے لئے کافی نہیں، اور اس طرح ان مذہبی دیوانوں کو اپنے لئے راستہ کھلا مل گیا ہے۔ اور بہت سے بچے انہی "خوجوں" کے قائم کئے ہوئے اسکولوں کا رخ کر رہے ہیں۔

اس مہینے کے شروع کی بات ہے کہ انقرہ یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں ایک لڑکی نے کلاس میں دوپٹہ سر پر اوڑھنے پر شدید اصرار کیا تو اسے کلاس سے نکال دیا گیا تھا، اس واقعہ پر طلباء نے ہڑتال شروع کر دی، ان کا مطالبہ یہ تھا کہ فیکلٹی کا "ڈین" مستعفی ہو جائے، انہوں نے اسے "طلباء کا دشمن" بھی قرار دیا۔ یہ واقعہ عرصے تک بہت سے ترکی اخباروں کا موضوع گفتگو بنا رہا، اور اب جسٹس پارٹی کے بعض ارکان نے لڑکی کی حمایت کرنے کے لئے اس مسئلے کو پارلیمینٹ میں بھی اٹھایا ہے۔

سبز جھنڈے لہراتے ہیں

کئی تنظیمیں ایسی بھی ہیں جو اپنے آپ کو نیشنلسٹ اور "روایت پرست" کہتی ہیں، انہوں نے کمیونزم اور ملک میں بائیں بازو کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے خلاف احتجاج کرنے کے بہانے عوامی مظاہرے بھی شروع کر دیئے ہیں، انقرہ اور استنبول میں جو مظاہرے ہوئے ان میں لوگوں نے سبز پرچم ہاتھ میں لے کر مارچ کیا (سبز پرچم مسلمانوں کے رنگ کی نمائندگی کرتا ہے) اور یہ نعرے لگائے کہ:

"ترکی میں اسلام ہی سربلند ہو گا"

ان مظاہروں کا رخ کمیونزم سے زیادہ لادینیت اور تجدد پسندی کے خلاف تھا۔

اس کے علاوہ اس مہینے کے شروع میں بورسہ شہر کے اندر دائیں بازو کی مختلف تنظیموں کے طرف سے جو کانفرنس منعقد ہوئی اس نے بھی اتاترک کی اصلاحات اور ۱۹۶۰ء کے انقلاب کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ "

(Reproduced by "Yageen" July 7, 1968)

مسٹر سام کوهن کے اس مضمون کو ہم نے اس لئے بعینہ نقل کر دیا ہے کہ یہ عالم اسلام

کے ارباب فکر کے لئے اپنے دامن میں عبرت و موعظت اور فکر و نظر کے بہت سے پہلو رکھتا ہے، اس سے نہ صرف یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ترک عوام کے اصل جذبات کیا ہیں؟ بلکہ یہ بات بھی پوری طرح واشگاف ہو جاتی ہے کہ عالم اسلام کی وہ کون سے تحریکیں ہیں جن کی پیٹھ مغرب اور پوری دشمن اسلام دنیا تھپکتی رہتی ہے۔ اور وہ کون لوگ ہیں جو اس کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں؟

ہم ذیل میں اس مضمون کے بارے میں بعض ضروری گذارشات مختصراً پیش کرتے ہیں۔

بیسویں صدی کے ابتداء میں پورے عالم اسلام کو مغربی افکار و نظریات کے جس سیلاب کا مقابلہ کرنا پڑا، اس کے آگے بظاہر سب سے پہلے ہتھیار ڈال دینے والا ملک ترکی تھا، خلافت عثمانیہ اس سیلاب کے مقابلے کے لئے آخری بند کا کام دے رہی تھی، چنانچہ اسی کو مغرب دراز دستیوں کا سب سے پہلا نشانہ بننا پڑا، اور جب خلافت کے نظام کو تہس نہس کر کے مصطفےٰ کمال پاشا اور اس کی جماعت برسراقتدار آئی تو اس نے پورے جبر و استبداد کے ساتھ ترکوں کے دینی شعور اور اسلامی جذبہ کو کچلنے کی کوشش کی۔ شرعی اداروں اور محکموں سے اسلامی قانون کو دیس نکالا دے کر سوئٹزرلینڈ سے دیوانی اور اٹلی سے فوجداری قانون درآمد کیا، دینی تعلیم کو ممنوع کر دیا گیا، پردہ کو خلاف قانون قرار دے دیا، مخلوط تعلیم شروع کر دی، عربی حروف کی جگہ لاطینی رسم الخط جاری کیا، عربی میں اذان کو ممنوع قرار دے دیا۔ غرض یہ کہ اپنا سارا زور اس بات پر صرف کر دیا کہ ترک عوام سر سے لے کر پاؤں تک مغرب کی "نقل مطابق اصل" بن کر رہ جائیں۔ انتہا یہ ہے کہ عوام کے سروں سے ترکی ٹوپی اتروا کر انھیں ہیٹ پہنانے کے خبط نے نہ جانے کتنے بے گناہوں کو تختہ دار پر لٹکایا، اور اس انگریزی ٹوپی کی خاطر نہ جانے کتنے طویل عرصے تک ترکی کے کوچہ و بازار میدان جنگ بنے رہے۔

کمال اتاترک کا خیال غالباً یہ تھا کہ انگریزی ٹوپی کے ذریعہ ترکوں کے سروں میں انگریزی دماغ بھی منتقل ہو جائے گا اور جس جبر و استبداد کے ساتھ اسلامی شعور کو فنا کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں، ان کے پیش نظر اس کا یہ خیال بے بنیاد بھی نہ تھا، لیکن شاید اسے یہ معلوم نہ ہو کہ ع

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے

اسلام کی محبت و عظمت کا جذبہ جو ترکوں کی رگوں میں خون حیات بن کر دوڑتا تھا، کچھ عرصے کے لئے دب تو گیا، لیکن سرے سے مٹ نہ سکا۔ ٹھیک اس وقت بھی جب ترکی میں کمال اتاترک کی آمریت اپنے شباب پر تھی اور بیرونی دنیا یہ سمجھ رہی تھی کہ اب ترکی میں شاید اسلامی شعور کا کوئی نشان باقی نہ رہا ہو، مظلوم و مقہور ترکی عوام کے اس دینی جذبے کی جھلکیاں اس وقت بھی نظر آتی تھیں، اور حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے والے اس بات سے بے خبر نہ تھے، ترکی کی معروف خاتون خالدہ ادیب خانم نے (جو خود بھی بڑی حد تک تجدد پسندی کی طرف مائل تھیں) ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ اپنی کتاب ـــ Conflict of East) (and West in Turkey میں لکھا تھا کہ:-

> "فی الحال ترکی میں سطح پر تو یہی نظر آتا ہے کہ مغرب کو وہاں فتح نصیب ہوئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ترکوں کی روح میں مشرق اب بھی ایک اندر اندر بہتے ہوئے دھارے کی طرح موجود ہے۔"
>
> (ص ۲۰۲ طبع دوم ۱۹۶۳ء)

"یہ اندر اندر بہتا ہوا دھارا" اب رفتہ رفتہ پھر سطح پر آ رہا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں جو پہلے انتخابات ہوئے ان میں کمال اتاترک اور عصمت انونو کی پارٹی کو سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا، اور اس کی جگہ عدنان مندریس کی ڈیموکریٹک پارٹی بر سراقتدار آئی جس نے اسلامی سرگرمیوں پر لگی ہوئی پابندیوں کو رفتہ رفتہ اٹھا دیا۔ اس کے بعد ایک مختصر عرصے کے لئے عصمت انونو کی ری پبلکن پارٹی پھر زبردستی ملک پر قابض ہوئی اور اس نے عدنان مندریس جیسے قائد کو تختہ دار پر لٹکایا، لیکن اب پھر وہاں جسٹس پارٹی کی حکومت ہے جو اسلام کے معاملے میں عدنان مندریس کی پیروی کر کے عوام کے دل کی دھڑکنوں کی ترجمانی کر رہی ہے ترکی کے موجودہ صدر جناب جودت صونائی نے حال ہی میں اپنے عوام کو عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر پیغام دیتے ہوئے کہا تھا کہ:-

> "حالات کا تقاضا ہے کہ ہم تمام غیر اسلامی نظریات اور باطل تحریکات کے سامنے سینہ سپر ہو جائیں، صرف دین اسلام دین وحدت ہے، امت اسلامیہ کا دستور صرف قرآن کریم ہے، حالات ہمیں مجبور کر رہے ہیں کہ ہم سب قرآن کریم کو مضبوطی سے تھام لیں اور ترکی قوم خدا کے فضل سے اسلام کی سچی دعوت کی پوری طرح حفاظت کرنے

کی اہل ہے۔"

(ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک صفر ۸۸ھ بحوالہ روزنامہ ایلاد مکہ مکرمہ شمارہ ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ)

حال ہی میں ترکی کے ایک معروف عالم دین دارالعلوم تشریف لائے تو انہوں نے بتایا کہ جس ملک میں کبھی کمال اتاترک نے قرآن کریم کو اٹھا کر شیخ الاسلام کے سر پر دے مارا تھا، آج اسی ملک میں قرآن و سنت کی تعلیم کے لئے ہزاروں کی تعداد میں مدارس قائم ہیں، یہاں تک کہ نئی نسل کے وہ نوجوان جو کبھی ضیاء گوک الپ کی تحریروں سے متاثر تھے آج بھی یہ محسوس کر رہے ہیں کہ "جدت" کے نام پر ان کے ساتھ کتنا بڑا فراڈ کھیلا گیا ہے۔

ترکی کے یہ بدلتے ہوئے حالات جہاں ہمارے لئے مسرت انگیز اور امید افزا ہیں وہاں ہمیں اپنے طرز عمل کو متعین کرنے کے لئے گہرے غور و فکر کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ ترکی عالم اسلام کی وہ پہلی تجربہ گاہ تھی جہاں مغربی افکار کا سب سے پہلا تجربہ کیا گیا، وہاں مغربیت کی تحریک کو نظری میدان میں ضیاء گوک الپ جیسے فکری رہنما بھی میسر آئے، اور سیاسی میدان میں کمال اتاترک جیسے انتہا پسند ڈکٹیٹر بھی، اور اس طرح افہام و تفہیم سے لے کر جبر و استبداد تک کوئی طریقہ ایسا نہیں ہے جو مغربی تجدد کی تحریک نے اس ملک میں اختیار نہ کیا ہو، اور چوں کہ یہ ملک ایک طرف تمام عالم اسلام کے لئے نہ صرف سیاسی بلکہ جذباتی حیثیت سے بھی ایک مرکز کی حیثیت رکھتا تھا، اور دوسری طرف یورپ سے جغرافیائی اعتبار سے بالکل ملا ہوا تھا، اس لئے اہل مغرب نے یہاں تجدد کی تحریک کو پروان چڑھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، پھر کم و بیش تیس سال تک یہاں اسلامی شعور کو فنا کرنے کا ہر طریقہ آزمایا گیا، اور بقول پروفیسر ٹائن بی:-

> "ہٹلر کے ہم عصر مصطفےٰ کمال اتاترک نے ایک زیادہ موزوں طریقہ اختیار کیا، ترکی ڈکٹیٹر کا مقصد اپنے ہم وطنوں کے ذہن کو ..... زبردستی مغربی تمدن کے سانچے میں ڈھالنا تھا، اور انہوں نے کتابیں سوخت کرنے کے بجائے حروف تہجی کو بدل ڈالنے پر قناعت کر ڈالی ..... اب کتابوں کو جلانے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ کیونکہ حروف تہجی جو ان کی کنجی کی حیثیت رکھتے تھے وہی منسوخ کر دیئے گئے تھے، اب یہ ذخائر اطمینان کے ساتھ الماریوں میں بند پڑے رہ سکتے

تھے، علاوہ چند سن رسیدہ علماء کے ان کو ہاتھ لگانے والا اب کوئی نہ تھا۔" مطالعہ تاریخ ص۵۱۸، ۵۱۹ بحوالہ مولانا ابوالحسن علی ندوی: اسلامیت اور مغربیت ص۶۷)

اس طرز عمل کے ذریعہ ترکی میں عرصہ دراز تک اسلام کی اصلی تعبیر کو (جسے ہمارے اہل تجدد رجعت پسندی کے نام سے یاد کرتے ہیں) کم از کم میدان عمل سے بالکل ہٹا دیا گیا تھا، چنانچہ چند سال پہلے تک وہاں تجدد کی بلاشرکت غیرے حکمرانی رہی اور اسے کسی رکاوٹ کے بغیر اپنے پورے حوصلے نکالنے کا موقعہ ملا۔

سوال یہ ہے کہ اس طویل عرصے میں تجدد کی بلاشرکت غیرے حکمرانی نے ترکی کو کیا دیا؟ کیا ترکی کے باشندوں کو پہلے سے زیادہ نہیں، پہلے جیسا امن و سکون اور سکھ چین نصیب ہو سکا؟ کیا اس عرصے میں وہاں کوئی نمایاں سائنس داں پیدا ہوا؟ کسی دوسرے علم و فن میں کوئی ایسی شخصیت ابھری جس نے فکر اور فلسفہ کے میدان میں کوئی نئی راہ نکالی ہو؟ کوئی ایسا مفکر سامنے آیا جس نے اس تہذیب میں کسی قابل قدر چیز کا اضافہ کیا ہو؟ کوئی ایسا صاحب دل پیدا ہوا جس نے اسے قبرص ہی کے مسئلے سے نجات دلا دی ہو، کوئی ایسا قائد اسے میسر ہوا جس نے اسے اقوام عالم کی صف میں کوئی ممتاز جگہ عطا کی ہو؟ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس ملک کو جس کا سکہ کبھی کم و بیش ایک تہائی دینا پر چلا کرتا تھا اس کی سابقہ سیاسی عظمت، و بین الاقوامی وقار اور عالم اسلام کی قیادت کے منصب کا کوئی بدل نصیب ہوا؟

اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی میں ہے، تو اس صورت حال سے اس کے سوا اور کیا نتیجہ نکلتا ہے کہ زندگی کے بنیادی مسائل میں اسلام اور مغرب کے درمیان "مصالحت" کا کوئی امکان نہیں ہے، جس مصالحت کی تبلیغ تجدد کا مکتب فکر کر رہا ہے، اس نے عالم اسلام کو دکھتے ہوئے زخموں کے سوا کچھ نہیں دیا، وہ مسلمانوں کے حقیقی مسائل کو حل کرنے میں قطعی طور پر ناکام رہی ہے، اور تجدد کی سب سے پہلی تجربہ گاہ نے اس حقیقت کو خوب اچھی طرح واشگاف کر دیا ہے کہ جو قوم اپنا ذاتی تشخص کھو کر اور اپنی خود داری کو پامال کر کے غیروں کی اندھی نقالی کی روش اختیار کرتی ہے وہ کبھی زندگی کی شاہراہ پر خود اعتمادی کے ساتھ قدم نہیں بڑھا سکتی اور حقیقت یہ ہے کہ اسے ایک مستقل قوم کی حیثیت سے دنیا میں زندہ رہنے کا بھی حق کیوں رہے جب کہ وہ خود اس حق سے دست بردار ہو چکی ہو۔

اسی حقیقت کا شعور ہے جو آج ترکی کے عوام و حکام کو اپنی زندگی کی لائن تبدیل کر کے حقیقی اسلام کی آغوش میں پناہ لینے پر مجبور کر رہا ہے، ترکی کے یہ اقدامات ہر حقیقت پسند انسان کی طرف سے تحسین و آفرین کے مستحق ہیں، اور ساتھ ہی ان کے واسطے سے ترک عوام و حکام کی یہ ہمدردانہ آواز ہمیں سنائی دے رہی ہے کہ ع

من نہ کردم، شما حذر بکنید

لیکن عالم اسلام کے لئے یہ خبریں کتنی مسرت انگیز کیوں نہ ہو، غیر مسلم اور بالخصوص مغربی دنیا کے تیور اس پر بری طرح بگڑ رہے ہیں اور اسی کی ایک ہلکی سی جھلک مسٹر سام کوہن کے مذکورہ بالا مضمون میں دیکھی جا سکتی ہے، اس مضمون کے ذریعہ آپ اسلام کے بارے میں مغرب کے ذہن کا بھی مطالعہ کر سکتے ہیں، اگر آپ بہ نظر غائر اس مضمون کو پڑھیں گے تو مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

(۱) ایک طرف مضمون نگار اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ ملک کی اکثریت احیاء اسلام کی حامی ہے، اسی لئے عدنان مندریس کی پارٹی نے اکثریت کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے مذہبی تعصب کو گوارا کیا تھا اور دوسری طرف وہ ترکی کو دو کیمپوں میں تقسیم کرنے اور جمہوریت کے لئے خطرہ بننے کا الزام بھی اسی "اکثریت" کو دیتا ہے۔ یہ اس مغرب کا ذہن ہے جو "جمہوریت" کو جزو ایمان قرار دیتا ہے

(۲) پھر وہ ۱۹۶۰ء کے انقلاب کے حوالے سے موجودہ حکومت کو عدنان مندریس کا پیرو قرار دے کر اس پر اپنی ناراضی کا اظہار کرتا ہے کہ "احیاء اسلام کی وکالت کرنے والوں" کے ساتھ کیوں رواداری برت رہی ہے؟ —— یہ اس مغرب کا اعتراض ہے جس کی زبان "رواداری" اور "عدم مداخلت" کی تبلیغ کرتے نہیں سوکھتی۔

(۳) پھر اس مضمون کا بڑا ہی دلچسپ جملہ یہ ہے کہ:

"بعض لوگوں نے کھلم کھلا شریعت کو دوبارہ نافذ کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔"

گویا یہ مطالبہ ایک ایسا جرم ہے جس کا "کھلم کھلا" انجام دینا بنیادی حقوق انسانی کی خلاف ورزی ہے ـــ یہ اس مغرب کا ذہن ہے جسے "آزادی تحریر و تقریر" کی اہمیت کا بڑا احساس ہے۔

(۴) ایک اور بات جو بہت زیادہ قابل توجہ ہے، مضمون نگار کا یہ ارشاد ہے کہ:

"انہوں نے کمیونزم اور ملک میں بائیں بازو کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے خلاف احتجاج کرنے کے بہانے عوامی مظاہرے بھی شروع کر دیئے ہیں.... ان لوگوں نے سبز پرچم ہاتھ میں لے کر مارچ کیا۔"

ملاحظہ فرمایئے کہ "کمیونزم" کا یہ حریف اس بات پر کسی مسرت کا اظہار نہیں کرتا کہ ان لوگوں نے کمیونزم کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے خلاف احتجاج کیا، اس کے بجائے اسے پریشانی اس بات سے ہے کہ انہوں نے سبز پرچم کیوں اٹھائے ہوئے تھے؟ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سرمایہ دار دنیا کو اصل خطرہ کمیونزم سے ہے یا اسلام سے؟ ـــ اس موقع پر ہمیں اقبال مرحوم کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" یاد آ رہی ہے جس میں ابلیس نے اپنے چیلوں سے بڑے پتے کی بات کہی تھی کہ ع

مزدکیت فتنہ فردا نہیں اسلام ہے

(۵) آخر میں اس مضمون کے اندر ہمارے تجدد پسند طبقے کے لئے ایک اور قابل غور پہلو بھی ہے، اور وہ یہ کہ اس جیسے مضامین کو دیکھ کر تجدد پسند حضرات کو ایک بار سنجیدگی کے ساتھ یہ ضرور سوچنا چاہئے کہ یہ امریکی یہودی نامہ نگار اور اس جیسے بہت سے غیر مسلم مغربی باشندے عالم اسلام میں "تجدد" کے اثرات کو پھیلتا دیکھ کر اس قدر خوش کیوں ہوتے ہیں؟ اور انہیں "احیاء اسلام" کی ہر کوشش سے کیوں ڈر لگتا ہے؟ کیا بعید ہے کہ اگر وہ اسی پہلو سے غور فرمائیں تو انہیں اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہونے لگے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سقوط بیت المقدس کے اسباب

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار!

بلاآخر اسرائیل کے ہاتھوں عربوں کو شکست ہو گئی، عرب ممالک جو مقبوضہ فلسطین کو اسرائیل کے چنگل سے آزاد کرانے کا عزم لے کر چلے تھے، خود اپنے خطہ زمین سے چوبیس ہزار مربع میل کا علاقہ کھو بیٹھے، بیت المقدس ـــ ہمارا قبلہ اول ـــ ہمارے ہاتھوں سے چھن گیا۔ مسجد اقصیٰ جو دن میں پانچ مرتبہ اذانوں کی آواز سے گونجا کرتی تھی، آٹھ سو سال کے بعد یکلخت خاموش ہو گئی، فلسطین کی مقدس سرزمین جہاں کم و بیش ایک لاکھ انبیاء علیہم السلام کے سانسوں کی مہک آج بھی موجود ہے، اس بدطینت قوم کی شکار گاہ بن گئی جس کی لغت میں امن و انصاف اور اخلاق و شرافت کے نام کا کوئی لفظ نہیں ہے، صحرائے سینا جو کبھی یہودی قوم کے لئے "میدان تیہ" بنا تھا، آج وہاں اسرائیل کے فاتح ٹینک دندنا رہے ہیں، کوہ طور جسے باری تعالیٰ کی تجلی کا شرف حاصل ہوا تھا، اور جس کے دامن میں یہودیوں پر عذاب الٰہی کے کوندے لپکے تھے، آج اسی کوہ طور پر "نجم یہود" کا پرچم لہرا رہا ہے، شام، اردن اور بیت المقدس کی وہ سرزمین جسے قرآن کریم نے ہمیشہ "ارض مبارکہ" اور "ارض مقدسہ" کے نام سے یاد کیا ہے آج وہی "ارض مبارک" قرآن پر ایمان رکھنے والوں کے خون سے لالہ زار بنی ہوئی ہے، وہاں (بزعم خود) خدا کے محبوب بیٹے اپنی سنگینوں کی نوک سے وحشت و بربریت کا ایک نیا باب لکھ رہے ہیں، مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے، ان کے گھر بار چھینے جا رہے ہیں، ان کی عصمتیں لٹ رہی ہیں، انسانیت کا منہ نوچا جا رہا ہے اور معاہدہ جنیوا کو ظلم و ستم کی اس آگ کا ایندھن بنا لیا گیا ہے جو توحید کے فرزندوں کے لئے سلگائی گئی ہے۔

بلاشبہ یہ موجودہ عالم اسلام کا سب سے بڑا المیہ ہے جس پر آج ہر مسلمان کا دل بے چین

اور آنکھ اشکبار ہے۔ الفاظ کے الٹ پھیر سے حقائق کا مفہوم نہیں بدلا کرتا، ہمیں کھل کر اعتراف کرنا چاہئے کہ یہ ایک زبردست شکست ہے، ایک ایسی شکست جس کی نظیریں اسلام کی تاریخ میں نظر نہیں آتیں، کہ صرف اسی گھنٹے میں متعدد عرب ملکوں کی پوری طاقت تباہ و برباد ہو گئی، آٹھ ہزار مربع میل پر بسنے والے ملک نے چوبیس ہزار مربع میل فتح کر لیا۔ آٹھ سو سال کے بعد بیت المقدس سے ہاتھ دھو بیٹھنا کوئی ایسا زخم نہیں ہے جسے آسانی سے بھولا جا سکے، یہ زخم اس وقت تک ٹیسیں دیتا رہے گا جب تک کوئی صلاح الدین ایوبی اس پر مرہم رکھنے کے لئے کھڑا نہ ہو۔

لیکن ہمارا ایمان یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی واقعہ اور کوئی حادثہ بلاوجہ نہیں ہوتا، ہر حادثہ کے پیچھے ظاہری اسباب و عوامل کا ایک طویل سلسلہ ہوتا ہے، اسی طرح ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا کا ہر حادثہ اپنے پہلو میں عبرت و موعظت کا ایک عظیم الشان درس لے کر آتا ہے یہاں ہر ٹھوکر سنبھلنے کے لئے لگتی ہے، اور ہر سانحہ بیدار کرنے کے لئے آتا ہے، زندگی کے پر پیچ راستوں پر وہی قومیں ترقی کی منزلیں طے کر سکتی ہیں جو ٹھوکریں کھا کر سنبھلنے کا ہنر جانتی ہوں اور ان کے سینوں میں اپنی شکست کو ایک اتفاقی حادثہ قرار دینے کی بجائے اپنی خام کاریوں کا فطری نتیجہ سمجھنے کا حوصلہ ہو۔

اس لئے ہمارا کام اس المناک سانحے پر حسرت و افسوس کے آنسو بہا کر ختم نہیں ہو جاتا، ہماری تاریخ کا یہ زبردست المیہ ہم سے کچھ سوچنے سمجھنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور اگر ہم اس دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کا یہ مطالبہ پورا کرنا ہوگا۔ بلاشبہ عربوں کو موجودہ مختصر جنگ میں عبرتناک شکست ہوئی ہے، لیکن پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ قسم کھا کر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ حسرتناک شکست قدرت کا ایک تازیانہ ہے، اور اگر ہم نے اس تازیانے سے کوئی مفید سبق سیکھ لیا تو یہ شکست ایک شاندار فتح میں تبدیل ہو سکتی ہے، یہ آنسو بہا کر جی چھوڑ دینے کا موقع نہیں ہے، یہ عزائم کو تازہ اور امنگوں کو بیدار کرنے کا وقت ہے، یہ اپنی ان خامیوں اور کوتاہیوں کا جائزہ لینے اور ان کے تدارک کے راستے تلاش کرنے کا وقت ہے، جن کی وجہ سے ہمیں یہ شرمناک دن دیکھنا پڑا، آیئے آج کی نشست میں اس شکست کے اسباب اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج پر غور کرنے کی کوشش کریں۔

ہمدردی کے سطحی اور اوپری جذبات کا تقاضا تو یہ ہے کہ اپنے عرب بھائیوں کی اس مصیبت

کے وقت میں ان کی کسی ایسی غلطی کی کھل کر نشاندہی نہ کی جائے جو انہیں اس شکست کا مورد الزام قرار دیتی ہو، لیکن ہمارے نزدیک اس طریقے سے کوئی مفید نتیجہ بر آمد نہ ہو سکے گا، اور نہ یہ ان کی سچی خیر خواہی ہو گی، عالم اسلام کی اجتماعی بہبود کا تقاضہ یہ ہے کہ اس موقعہ پر ان تمام غلطیوں کی کھل کر نشاندہی کی جائے جو اس شکست کا سبب بنی ہیں، اس لئے ہم اپنی آئندہ صاف گوئی پر اپنے بھائیوں سے پیشگی معذرت چاہتے ہیں، اور چوں کہ اس تلخ نوائی کا محرک خیر خواہی کے سوا کچھ نہیں، اس لئے ہمیں امید ہے کہ یہ برادرانہ شکوے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ سنے جائیں گے۔

قرآن و سنت اور قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ پر غور کرنے سے یہ بات بالکل آشکار ہو جاتی ہے کہ کسی قوم یا کسی ملت کو دنیوی سربلندی محض اس بناء پر نصیب نہیں ہوا کرتی کہ وہ آسمان سے عروج و اقبال کا پیدائشی حق دنیا میں لے کر آئی ہے۔ عادت اللہ شروع سے کچھ اس طرح جاری ہے کہ اس جہد و عمل کی دنیا میں ہر کو اس کی کوشش کے مطابق حصہ دیا جاتا ہے، مسلمان بھی قدرت کے اس اٹل قانون سے مستثنٰی نہیں ہیں، بلاشبہ ان کو "خیرالامم" کا قابل فخر خطاب عطا کیا گیا ہے، اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مسلمان قوم اللہ کی محبوب ترین قوم ہے، یہ بات بھی اپنی جگہ تسلیم ہے کہ روئے زمین پر کوئی دین مسلمانوں کے دین کا ہم عصر نہیں ہے ——، لیکن ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جا سکتا کہ کوئی قوم صرف زبان سے اپنے مسلمان ہونے کا دعوٰی کر کے ہاتھ پیر ہلائے بغیر اوج ثریا کو چھو سکتی ہے، اور اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے تب بھی ترقیوں اور کامیابیوں کے ذمے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ خود آکر اس کے پاؤں چومیں۔

قرآن کریم اور تاریخ اسلام کا ایک سرسری مطالعہ بھی یہ بات ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ مسلمانوں کو سربلند کرنے کے لئے تمام وعدے دو شرطوں پر موقوف رکھے گئے ہیں۔

۱۔ صحیح معنی میں مسلمان بن کر اپنی زندگی کو ہر شعبے میں اسلام کے تابع بنا لینا۔

۲۔ ترقی کے ظاہری اسباب و وسائل جمع کرنے کی کوشش کرنا۔

یہ دو چیزیں وہ ہیں جن میں ہماری ترقی اور کامیابی کا راز مضمر ہے، اور جن کو قرآن کریم نے نہایت صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ ایک طرف ارشاد ہے:

و أنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين
اور تم سربلند ہو، اگر تم مومن ہو
دوسری طرف فرمایا جاتا ہے۔

و أعدوا لهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخيل
ترهبون به عدو الله و عدوكم

اور ان (دشمنوں) کے لئے ہر وہ قوت اور گھوڑوں کی چھاؤنیاں تیار کرو جن کی تم میں استطاعت ہے، اور جن کے ذریعہ تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو ڈراؤ گے۔

تاریخ اسلام کے جس انقلاب پر آپ نظر ڈالیں گے، قرآن کریم کے ان ارشادات کی صداقت واضح ہوتی چلی جائے گی جہاں مسلمانوں نے سچا مسلمان بن کر ظاہری وسائل و اسباب جمع کرنے کی امکانی کوشش کی ہے، تو خواہ وہ اس کوشش کے باوجود دشمن کے مقابلہ میں کتنے ہی کم حیثیت کیوں نہ رہے ہوں، ہمیشہ فتح کا سہرا ان ہی کے سر بندھا ہے۔ شکست کی ذلت مسلمان کو صرف اس وقت اٹھانی پڑتی ہے جب وہ ان دونوں احکام میں کسی سے منہ موڑ بیٹھا ہو۔

بیت المقدس کی تاریخ

بیت المقدس ہی کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈال لیجئے تو ہمارے اس دعوے کی تصدیق سامنے آجائے گی، بیت المقدس کو سب سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا اس زمانے کے مسلمان حضرت سلیمان علیہ السلام ہی کے پیروکار تھے، جب تک ان میں صلاح و فلاح اور جہد و عمل کے آثار باقی رہے صرف بیت المقدس ہی نہیں، حجاز اور یمن تک ان کے عروج و اقبال کا پرچم لہراتا تھا، اور بحیرہ روم کے مشرقی کناروں سے لے کر افریقہ کے مشرقی ساحلوں تک ان کی ایک ہی حکومت تھی، لیکن جب حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کا بیٹا رحبعام تخت پر بیٹھا تو اس نے اقتدار کے نشہ میں مست ہو کر اپنے والد ماجد کی تمام روایات کو پس پشت ڈال دیا۔ اس کا فوری نتیجہ تو یہ ہوا کہ حضرت سلیمانؑ کے ایک خادم یربعام نے مرکز کے خلاف بغاوت کر کے شمال میں اسرائیل کے نام سے ایک الگ سلطنت قائم کر لی، اب

بنی اسرائیل جو اس زمانے کے مسلمان تھے، دو حکومتوں میں بٹ گئے، شمال میں اسرائیلی سلطنت تھی جس کا پایہ تخت سامرہ (موجودہ نابلس) اور جنوب میں یہودیہ کی سلطنت جس کا مرکز یروشلم (بیت المقدس) تھا۔ــــ اس افتراق و انتشار کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ بنی اسرائیل کی جو عسکری قوت کبھی ملکہ سبا کے دروازوں پر دستک دیا کرتی تھی اب باہمی خانہ جنگی میں صرف ہونے لگی، یہودیہ اور اسرائیل دونوں سلطنتیں سالہا سال تک ایک دوسرے سے لڑتی رہیں۔
بنی اسرائیل کی تاریخ میں ۹۳۷ ق م سے لے کر ۵۸۶ ق م تک کا پورا عرصہ ان خانہ جنگیوں کی دل خراش داستان ہے، ایک ایک جنگ میں بعض اوقات پانچ پانچ لاکھ بنی اسرائیل کا خون بہا، مگر اقتدار کی یہ رسہ کشی بند نہ ہوئی، دوسری طرف بنی اسرائیل کی اکثریت نے اپنے آباؤ اجداد کے دین کو بالکل پس پشت ڈال کر بت پرستی اور ستارہ پرستی شروع کر دی، انوں نے عیاشی پر کمر باندھ لی، اور علماء میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر مذہبی اختلافات پھوٹ پڑے۔ اس دوران اللہ کی طرف سے جلیل القدر انبیاء علیہم السلام ہدایت کا اجالا پھیلانے کے لئے تشریف لاتے رہے، مگر چند وقفوں کو چھوڑ کر بنی اسرائیل کا زمانہ بداعمالیوں اور عیش پرستیوں میں بسر ہوا۔

قدرت کسی قوم پر اپنا قہر اور عذاب ایک دم سے نازل نہیں کرتی بلکہ پہلے اسے مختلف طریقوں سے جھنجھوڑتی ہے، چنانچہ اس موقعہ پر انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے علاوہ بنی اسرائیل کو بیدار کرنے کے لئے ہلکے ہلکے تازیانے بھی لگائے جاتے رہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد بیرونی طاقتیں ان پر حملہ آور ہوتیں اور ان کی سرحدوں کو مختصر کر کے واپس لوٹ جاتیں، کبھی مصر کا بادشاہ چڑھ آتا کبھی صور کا حکمراں حملہ کر دیتا، کبھی آرام کا فرمانروا یلغار کرتا ہوا یروشلم تک پہنچ جاتا۔ لیکن یہ تمام حملے جزوی طور پر نقصانات پہنچا کر واپس چلے جاتے، بنی اسرائیل دیکھ رہے تھے کہ بیرونی دشمن ہماری تاک میں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی فوجی قوت میں مسلسل اضافہ کر رہا ہے لیکن ان کی آنکھ نہ کھلی، عیش و آرام کے خلوت کدوں کو چھوڑ کر عمل کے خارزاروں میں اترنا ان کے مزاج نازک کے خلاف تھا۔

حضرت ارمیاء حضرت شعیا اور حضرت حزقیل علیہم السلام انہیں متواتر جھنجھوڑتے رہے کہ خدا کے لئے اپنی حالت درست کر لو، بابل کا بادشاہ تمہاری چار دیواری تک پہنچ چکا ہے، اور اگر تمہیں ہوش نہ آیا تو تمہارا نام و نشان مٹ جائے گا مگر (بابر بعیش کوش) کے نغموں میں مست لوگ بابل کی طرف سے پیٹھ موڑ کر یہ سمجھتے تھے کہ ہم مامون ہو چکے ہیں۔ اور یہود

علماء کو یہ گھمنڈ تھا کہ ہم اللہ کی محبوب ترین قوم ہیں۔ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت نہیں، دشمن جب یروشلم کا رخ کرے گا تو آسمان کی غیبی طاقتیں اس پر بجلیاں برسائیں گی اور وہ بھسم ہو کر رہ جائے گا۔

ان حالات میں ٹھیک اس وقت جب کہ حکام عیش ونشاط میں محو تھے، اور علماء اس بات پر مناظرے کررہے تھے کہ ایک سوئی کے ناکے پر کتنے فرشتے بیٹھ سکتے ہیں؟ —— بابل کا جابر بادشاہ بخت نصر ان پر قہر خداوندی بن کر نازل ہوا۔ یروشلم (بیت المقدس) اور اس کے گردو نواح سے بنی اسرائیل کا بیج مارا گیا، اس کی فوج کیا تھی؟ ایک طوفان تھی۔ جس نے مزاحمت کی ہر دیوار کو ڈھا کر یہودیوں کی پوری سلطنت کو پیوند زمین کر ڈالا۔ اور ظلم و ستم کے ایسے ایسے اسلوب ایجاد کیے جن کا تصور ہی رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے، بادشاہ کی آنکھوں کے سامنے اس کے بیٹے ذبح کر دیئے گئے، بادشاہ اور رہے سہے یہودی پابہ زنجیر بابل لے جائے گئے، اور پچاس سال تک بخت نصر کی غلامی میں حسرت و ندامت کے آنسو بہا کر اپنے دن کاٹتے رہے، قرآن کریم نے سورہ بنی اسرائیل میں اسی قہرالٰہی کو اس طرح بیان فرمایا ہے۔

بعثنا علیهم عبادالنا اولی بأس شدید فجاسوا خلل
الدیار وکان وعدا مفعولا

ہم نے ان پر اپنے کچھ بندے بھیجے جو شدید قوت والے تھے وہ گھروں
میں گھوم گئے اور یہ ہونے والا وعدہ تھا۔

اس زبردست طوفان نے بنی اسرائیل کی کچھ آنکھیں کھول دیں، ان کی غلامی کی زندگی پہلے کی بہ نسبت کافی پاکیزہ ہو چکی تھی، آپس کے اختلافات کم ہو گئے تھے، اور تمام لوگوں کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھے ہوئے تھے، قدرت نے انہیں ایک اور موقعہ دیا۔ ۵۳۶ ق م میں ایران کے بادشاہ خسرو نے بابل پر چڑھائی کر کے اسے فتح کر لیا۔ اور بنی اسرائیل پر رحم کھا کر انہیں دوبارہ بیت المقدس تعمیر کرنے اور فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دے دی، چنانچہ ۵۱۵ ق م میں بیت المقدس دوبارہ آباد ہوا، اور بنی اسرائیل نے حضرت عزیر علیہ السلام کی موجودگی میں رو رو کر توبہ کی، اور آئندہ خدا کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عہد کیا، کچھ عرصے تک یہ لوگ اپنے عہد پر قائم رہے، رفتہ رفتہ ان کی خوشحالی واپس آنے لگی، انہیں پھر حکومت تو نصیب نہ ہو سکی مگر مال و دولت اور وسائل و اسباب کی پھر فراوانی ہو گئی، اور عیش و مسرت کی زندگی پھر لوٹ آئی، قرآن کریم اسی نئی زندگی کا تذکرہ اس طرح فرماتا ہے۔

ثم رددنالکم الکرة علیهم فأمددناکم بأموال و بنین
وجعلناکم اکثر نفیرا.

اس کے ساتھ ہی اللہ کی طرف سے انہیں یہ تنبیہ بھی فرما دی گئی
کہ:۔

ان أحسنتم أحسنتم لانفسکم و ان أسأتم فلها
اب اگر تم اچھے کام کرو گے تو تمہارے لئے مفید ہوں گے اور اگر تم
نے بدکاری کی تو اپنا ہی کچھ بگاڑو گے۔

لیکن نکوکاری کی یہ زندگی پائدار ثابت نہ ہوئی، خوشحالی بڑھی تو عیش و نشاط کی وہ محفلیں پھر لوٹ آئیں، بت کدے پھر آباد ہونے لگے ____ فارغ البالی نصیب ہوئی تو ایک دوسرے سے جھگڑنے کا مشغلہ پھر زندہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ بنی اسرائیل پھر اسی حالت کو پہنچ گئے، جس میں ان پر بخت نصر کا عذاب نازل ہوا تھا، اس مرتبہ بخت نصر کی جگہ روم کے بادشاہ انتیوکس ایپی فانس نے ۱۶۵ ق م میں بیت المقدس پر حملہ کر کے دوبارہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، تورات کے تمام نسخے چن چن کر جلا دیئے، بنی اسرائیل کو ایک ایک کر کے تہ تیغ کیا اور جو لوگ بچ گئے انہیں لوٹ کھسوٹ کر جلاوطن کر دیا، قرآن کریم اس واقعہ کا ذکر اس طرح فرماتا ہے:۔

و اذا جاء وعدالاخرة لیسوء وجوهکم ولیدخلو
المسجد کما دخلوه أول مرة ولیتبروا ما علوا تتبیراً.

"اور جب آخری (عذاب) کا وعدہ آیا، تاکہ ■ (یعنی رومی) تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (اقصیٰ) میں داخل ہوں، جیسے کہ وہ (یعنی کلدانی) پہلی مرتبہ داخل ہوئے تھے، اور جس چیز پر ان کا غلبہ ہوا اس کو برباد کر دیں۔

یہ قوم یہود کو آخری موقع دیا گیا تھا، حکومت تو ان سے چار سو سال پہلے چھن چکی تھی، اب ہمیشہ کی ذلت و خواری ان کی قسمت میں لکھ دی گئی، اور کسی خطے میں یکجا ہو کر عزت کی زندگی گزارنے کا موقع بھی ان سے چھین لیا گیا، اس واقعہ کو آج دوہزار ایک سو بتیس سال ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد سے اب تک وہ بیت المقدس سے دور منتشر اور پارہ پارہ ہو کر زندگی

گزارتے رہے۔

قرآن کریم نے انیٹوکس کے حملے کا ذکر فرما کر ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرما دیا کہ:

عسى ربكم أن يرحمكم و ان عدتم عدنا وجعلنا جهنم للكفرين حصيراً

بہت ممکن ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کرے، اور اگر تم نے (ان غلطیوں کا) اعادہ کیا، تو ہم بھی (عذاب کا) اعادہ کریں گے، اور جہنم کو ہم نے کافروں کا قید خانہ بنا (ہی) رکھا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے اپنے حال کی اصلاح کر لی تو اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے گا۔ اور اگر اس رحم فرمانے کے بعد تم نے سابقہ غلطیوں کا اعادہ کیا تو پھر تمہارے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا ـــــ اللہ تعالیٰ کے اس رحم کا مظاہرہ اس طرح ہوا کہ بنی اسرائیل ہی کی ایک شاخ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے وقت آپ ؑ پر ایمان لے آئی، اس قوم کے اعمال یہودیوں کے مقابلے میں بسا غنیمت تھے، ان میں ایک طرف عبادت گزاروں کی کثرت تھی۔ دوسری طرف جہد و عمل کا جذبہ موجود تھا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عروج آسمانی کے بعد تین سو سال کی طویل جدوجہد کے نتیجے میں بنی اسرائیل کی یہ شاخ روما کی عظیم سلطنت کی مالک بن گئی، اور بیت المقدس بھی ان کے قبضہ میں آگیا۔ تقریباً چار سو سال تک عیسائیوں نے روم میں بڑے جاہ و جلال کی حکومت کی، لیکن مرور ایام کے ساتھ اس قوم نے ایک طرف اپنے اصل دین کو بری طرح بگاڑ ڈالا اور دوسری طرف اس میں بھی رفتہ رفتہ یہودیوں کی سی خصلتیں پیدا ہونے لگیں۔

بالآخر آٹھویں صدی عیسوی میں فاران کی چوٹیوں سے ختم نبوت کا خورشید عالم تاب ؐ نمودار ہوا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لاکر یہود و نصاریٰ کے اس دین کو اپنی اصلی شکل میں پیش فرمایا جسے انہوں نے بری طرح مسخ کر دیا تھا، اب تورات و انجیل کے صحیح پیرو مسلمان قرار پائے، انہوں نے اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں ایک طرف سیرت و اخلاق کی پاکیزگی کا بے نظیر نمونہ پیش کیا، اور دوسری طرف جہد و عمل کی بالکل نرالی مثالیں قائم کیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک مختصر سے وقت میں قیصر و کسریٰ کا غرور خاک میں ملاتے ہوئے آگے بڑھے، اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا پر چھا گئے۔ ان کی تعداد کم تھی ان کے وسائل دشمنوں کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھے، مگر وہ قوت ایمانی سے آراستہ ہونے کے ساتھ

ساتھ جہد و عمل کے جذبے سے سرشار تھے، چنانچہ دوسری طاقتوں نے ان کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے، اور اسی دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صلح کے ذریعہ بیت المقدس عیسائیوں سے لے لیا۔

مسلمانوں نے تقریباً پانچ سو سال اس طرح حکومت کی کہ بنیادی طور پر وہ مومن بھی تھے، اور مجاہد بھی ـــــ بالآخر متعدد انقلابات کے بعد بیت المقدس کی حکومت سلجوقی ترکوں کے ہاتھ میں آگئی۔ یہ نومسلم لوگ تھے، اسلام کے تازہ تازہ جوش سے سرشار اور جذبہ جہاد سے معمور، مگر اسلامی تعلیمات ابھی تک ان میں رچی بسی نہ تھیں، ان کا یہ جذبہ اعتدال سے کچھ تجاوز کر گیا، اور اس کے نتیجے میں انہوں نے ان عیسائیوں پر کچھ پابندیاں عائد کر دیں جو بیت المقدس کی زیارت کے لئے آتے تھے۔ یہ پابندیاں ان فیاضانہ شرائط کی رو کے خلاف تھیں جن پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل بیت المقدس سے صلح کی تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ رومی عیسائیوں نے ان پابندیوں کے خلاف صلیبی جنگوں کی مہم شروع کی، مسلمانوں میں اس وقت خاصی کمزوری آچکی تھی، اس لئے انہوں نے ایک مختصر وقفے کے لئے بیت المقدس مسلمانوں سے چھین لیا۔

لیکن مجموعی طور پر مسلمان پھر مسلمان تھے، اللہ تعالیٰ نے سلطان صلاح الدین ایوبی کو اس مقصد کے لئے کھڑا کر دیا جو ایمان کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر تھے، انہوں نے ہلال و صلیب کے معرکے میں پے در پے عیسائیوں کو شکست دی، اور کچھ ہی عرصے کے بعد بیت المقدس واپس لے لیا، یہ واقعہ چھٹی صدی ہجری کی ابتداء میں پیش آیا تھا، اس وقت سے آج تک بیت المقدس مسلسل مسلمانوں ہی کے قبضے میں چلا آتا تھا۔

اس طویل تاریخ کو بیان کرنے کا مقصد یہ دکھلانا ہے کہ گزشتہ مہینے بیت المقدس اور اس کے گرد و نواح میں جو کچھ ہوا وہ اس قانون قدرت کے عین مطابق ہے جو اس سرزمین پر تین ہزار سال سے نافذ چلا آرہا ہے، جس زمانے میں بنی اسرائیل اللہ کی محبوب ترین امت تھی، اس وقت وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اپنے آپ کو بخت نصر اور انیتوکس کے عذاب سے نہ بچا سکی، آج مسلمان خدا کی محبوب ترین امت ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنی تمام بداعمالیوں اور عیش کوشیوں کے باوجود وہ فتح و کامرانی اور عزت و سربلندی کا دائمی حق اپنے پاس رکھتی ہے ـــ اس لئے اگر اس کی بداعمالیوں کے صلے میں اس پر اسرائیل جیسے کمینہ دشمن کو مسلط کر دیا گیا ہے تو تعجب کا کون سا مقام ہے؟

تاریخ کے اس طویل سلسلے کو پیش نظر رکھ کر حالیہ جنگ کا جائزہ لیجئے تو اس کے پس منظر میں بھی عربوں کی شکست کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں ملے گا کہ انہوں نے ان دو شرطوں میں سے ایک کو بھی پورا نہیں کیا تھا، جن پر قرآن کریم نے مسلمانوں کی فتح و کامرانی کو موقوف قرار دیا ہے ایک طرف وہاں سے ایمان کی وہ روح رخصت ہو چکی تھی جو.... انتم الاعلون کی دائمی بشارت لے کر آتی ہے، اور دوسری طرف ان سے جہد و عمل کا وہ جذبہ فنا ہو چکا تھا جس کی طرف اعدوالہم ما استطعتم کے ارشاد میں اشارہ کیا گیا ہے۔

شکست کے اسباب

ان کی شکست کے کھلے اسباب یہ تھے۔

(۱) سب سے پہلا اور بنیادی سبب یہ تھا کہ انہوں نے عرصہ دراز سے اسلام کی واضح تعلیمات کو بالکل پس پشت ڈال رکھا تھا، وہ سالہا سال سے یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہمیں مغربی سامراج اور اس کے حاشیہ نشینوں سے نفرت ہے، لیکن ان کی زندگی کی ہر نقل و حرکت اس دعویٰ کو جھٹلاتی ہے۔ ان کے افکار، ان کی تہذیب، انکی معاشرت، ان کالباس، غرض سر سے لے کر پاؤں تک ہر چیز پکار پکار کر یہ کہتی ہے کہ ہم زبان سے مغربی سامراج کو کتنا برا بھلا کہتے رہیں، لیکن ہمارے دل اسی کی محبت و عظمت سے آباد ہیں، ہمیں تہذیب ان ہی کی پسند آتی ہے، افکار ان ہی کے اچھے لگتے ہیں، اور معاشرت ان ہی کی محبوب ہے۔

اسی طرز عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ عرب ملکوں میں جا کر دیکھئے تو یہ پہچاننا مشکل ہو گا کہ یہ مسلمانوں کا ملک ہے، وہی عریانی، وہی فحاشی، وہی عیش پرستی، اور وہی خدا اور رسولؐ کے احکام سے دوری! یہاں تک کہ ایک روایت تو یہ سننے میں آئی ہے کہ اسرائیلی حملہ آوروں نے تو حملے سے دو دن پہلے روزے رکھ کر پیش قدمی کی تھی، مگر قاہرہ کے بعض ہوٹلوں میں اس وقت بھی رقص و سرود کی محفلیں گرم تھیں، جب اسرائیل کے بمبار طیارے مصر میں داخل ہو رہے تھے۔ اور یہ بات تو ہر کس و ناکس کو معلوم ہے کہ اب سے چند ماہ پہلے تک مصر میں اسلام کا نام لینے والوں کے لئے پھانسی کے تختے لٹکے ہوئے تھے، مصر اور شام میں جس جس طرح علماء پر مظالم ڈھائے گئے وہ ہر شخص کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ انتہا یہ ہے کہ ایک طرف اسرائیل کے یہودی علماء عرب ممالک کے خلاف اپنے عوام میں مذہبی جوش پیدا کر رہے تھے۔ مگر

دوسری طرف مصر اور شام کے علماء کو تہ خانوں میں قید کر کے اسلام پسندی کی سزا دی جا رہی تھی۔

(۲) اسلام کی تعلیمات سے دور جا نکلنے کا ہی نتیجہ یہ تھا کہ عرب ممالک اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے لئے اسلام کے بجائے "عرب قومیت" کا نعرہ لگا رہے تھے، انہوں نے برسوں سے وطنی قومیت کے اس بت کو اپنی آستینوں میں جگہ دے رکھی تھی جسے توڑنے کے لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع کے خطبے میں صاف اعلان فرما دیا تھا کہ:۔

لا فضل لعربی علی عجمی

"کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں"

"اسرائیل" میں مختلف نسلوں اور مختلف خطوں کے یہودی یک دل اور یک جان ہو کر اپنی فوجی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ان میں کوئی بات یہودی مذہب کے سوا مشترک نہیں تھی ان کی نسلیں مختلف، وطن جدا، زبانیں الگ، مگر مذہب کے نام پر وہ ایک ہو رہے تھے، اس مذہبی اتحاد نے ان میں مذہبی جنگ کی روح بیدار کر دی تھی ـــــ اس لئے ان کا مقابلہ وطنی قومیت کی بنیاد پر کیا ہی نہیں جا سکتا تھا، ان کا موثر مقابلہ کرنے کے لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ مسئلہ فلسطین کو صرف عربوں کا نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا مسئلہ بنا کر پیش کیا جاتا۔ اور انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک کے تمام مسلمانوں کو اس مہم میں شریک کیا جاتا، پاکستان، ترکی، اور ایران نے حالیہ جنگ کے موقعہ پر اپنی سابقہ تلخیوں کو بھلا کر عربوں کی حمایت میں جو مثالی کردار ادا کیا وہ یہ ثابت کرنے کے لئے بالکل کافی ہے کہ اگر اہل عرب فلسطین کے مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ تمام مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش کرتے تو یہ بات کچھ مشکل نہیں تھی، اور اگر یہ عظیم الشان اتحاد قائم ہو جاتا تو نہ صرف دنیا کے نقشہ پر سے اسرائیل کا وجود مٹ چکا ہوتا بلکہ کشمیر سے لے قبرص تک کے تمام مسلم مسئلے خود بخود حل ہو جاتے، اور یہ اسلامی ممالک جو اپنے مسائل حل کرنے کے لئے کبھی امریکہ، کبھی روس اور کبھی چین کی طرف دیکھنے پر مجبور ہیں، ہر بیرونی احتیاج سے آزاد ہو جاتے، دنیا کے نقشے پر ایک نظر ڈال کر دیکھئے قدرت نے عالم اسلام کو جغرافیائی اعتبار سے کس طرح ایک لڑی میں پرو رکھا ہے، دنیا کی کیسی کیسی اہم شاہراہیں ان کے قبضہ میں ہیں، کیسے کیسے قدرتی وسائل انہیں میسر ہیں، انسانی وسائل کے اعتبار سے بھی وہ کتنے مالا مال ہیں، کرہ زمین کے بالکل بیچوں بیچ واقع ہونے کے سبب پوری دنیا کا دل کس طرح ان کے ہاتھ میں ہے ـــــ اگر یہ قدرتی انعامات اتحاد اور تنظیم کے ساتھ کام میں

لائے جائیں تو کیا وجہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنا جائز مقام حاصل نہ کر سکیں؟

لیکن ان تمام کھلے کھلے حقائق کے علی الرغم عرب کی سرزمین سے عین دوران جنگ بھی العزۃ للہ کے بجائے العزۃ للعرب کے نعرے بلند ہو رہے تھے، کیا یہ غضب خداوندی کو دعوت دینے کا خود جمع کردہ سامان نہیں تھا۔ اس نظریہ قومیت کو ہوا دینے سے چند در چند نقصانات پیدا ہوئے۔ ایک طرف تو اسرائیل جیسے دشمن کے مقابلے کے لئے جس کی پشت پناہی پوری مغربی دنیا کر رہی تھی۔ موثر حریف تیار نہ ہو سکا، دوسرے اس طریقے سے خود عربوں میں پھوٹ پڑ گئی، جو لوگ قومیت کی بنیاد پر متحد ہونے کو غلط سمجھتے تھے، انہوں نے اپنا ایک الگ بلاک بنا لیا۔ اور دونوں عرب بلاکوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی، دونوں کی قوتیں مشترک دشمن کے مقابلہ کے بجائے باہمی افتراق میں صرف ہونے لگیں، دونوں کے تمام وسائل نشر و اشاعت آخر وقت تک ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے میں مصروف ہوتے رہے، انتہا یہ ہے کہ جس وقت اسرائیل کے روپ میں امریکہ اور برطانیہ متحد ہو کر عرب ممالک پر چڑھے چلے آ رہے تھے، ٹھیک اس وقت بھی مصر کی اعلیٰ تربیت یافتہ پچاس ہزار افواج یمن کے اندر مسلم کشی میں مصروف تھیں۔

قومیت کے نظریئے کا تیسرا نقصان یہ ہوا کہ اس کے ذریعہ فوجوں میں جہاد کی " روح بیدار نہ ہو سکی جو موت سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے، چار دن کی اس جنگ میں قاہرہ اور متحدہ ہائی کمان کا ریڈیو مسلسل یہ نعرے لگاتا رہا کہ:-

جاھدوا فی سبیل العروبۃ

عرب قومیت کی راہ میں جہاد کرو

مگر "جاہدوا فی سبیل اللہ" کا جملہ سننے کے لئے یہ گناہ گار کان ترستے ہی رہے: "العزۃ للعرب" کا نعرہ تو ہر ہر گھنٹہ کے بعد سننے میں آتا تھا، مگر "العزۃ للہ" کا جملہ ایک مرتبہ بھی نہیں سنا جا سکا ــــ لڑنے والے آخر مسلمان تھے اور مسلمان کبھی قوم و وطن کے مصنوعی غرور پر جان دینا پسند نہیں کرتا۔ وہ صرف لاالہ الا اللہ کا کلمہ ہی ہے جو اسے خون میں نہانے اور آگ میں کودنے کا ولولہ عطا کرتا ہے۔

صدر ناصر نے اپنے ایک بیان میں شکست کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا ہے کہ اسرائیل کی فوجی قوت ہم سے تین گنا زائد تھی۔ ان کا یہ کہنا اپنی جگہ درست ہے لیکن کیا ستمبر ۱۹۶۵ء کے جہاد میں بھارت کی عسکری طاقت پاکستان سے تین گنا زائد نہیں تھی؟ مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ

پاکستان کی مٹھی بھر افواج نے کس طرح ٹینکوں کے سیلاب کا رخ پھیر دیا تھا ـــــ وجہ یہ تھی کہ یہ جنگ نسل و وطن کے کسی خود ساختہ غرور پر نہیں لڑی گئی تھی، اس کی بنیاد صرف اور صرف لا الہ الا اللہ کا وہ زمزمہ بار کلمہ تھا جسے پڑھ کر صدر پاکستان نے خیبر سے سلہٹ تک کے ہر فرد میں اسلام کے نام پر کٹ مرنے کی حیرت انگیز روح دوڑا دی تھی۔

ان حالات میں یہ حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ معلوم ہو مگر اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ:۔

یہ شکست اسلام اور مسلمانوں کی نہیں عرب قومیت کی شکست ہے

(۳) ہم نے تعلیمات اسلام سے منہ موڑا، اور مغربی معاشرت و افکار کو بھی صرف آزادانہ عیش و عشرت کی حد تک اختیار کیا۔ دشمنوں کی مدافعت کے لئے جدید اسلحہ اور جدید طریق جنگ جو اسلام سے حاصل کرنے کی چیز تھی ہم نے اس کی طرف کوئی التفات نہ کیا، اسی کا نتیجہ ایک یہ تھا کہ ہم دشمن کے مقابلہ کے لئے مادی اعتبار سے بھی کوئی موثر تیاری نہیں کر سکے، اسرائیل کا خطرہ عربوں کے سروں پر گزشتہ بیس سال سے منڈلا رہا ہے، اس کے جارحانہ عزائم بھی کبھی پردے میں نہیں رہے، اس کی جنگی تیاریاں بھی ان کے سامنے تھیں، لیکن انہوں نے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوئی کوشش نہیں کی، قدرت نے انہیں بہترین قدرتی اور انسانی وسائل سے مالا مال کیا ہے، تیل پر موجودہ دنیا کی روح قائم ہے، اور اس علاقے میں انہیں اس "زر سیال" پر تقریباً اجارہ داری حاصل ہے، لیکن انہوں نے قدرت کی اس گراں بہا نعمت کو تمام و کمال ان غیر مسلموں کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھا ہے جن کی اسلام دشمنی کبھی راز نہیں رہی، اور خود اس تیل کی رائلٹی پر قناعت کر کے اس طرح بیٹھے ہوئے ہیں گویا اس نعمت کا اس سے بہتر کوئی مصرف نہیں ہو سکتا۔ سہل انگاری اور عیش کوشی کے سوا اس تلخ حقیقت کی اور کیا تاویل کی جا سکتی ہے کہ انہوں نے گزشتہ بیس سال میں اپنے یہاں ایسی ایک جماعت بھی پیدا نہیں کی جو تیل کے کنوؤں سے استفادے کا ہنر جانتی ہو، اور اپنی اس دولت کو غیر ملکیوں کے تسلط سے آزاد کرا سکے۔

پھر انہیں ان قدرتی وسائل کی صرف رائلٹی سے جو رقم حاصل ہوتی ہے وہ تناسب کے اعتبار سے دنیا کے امیر ترین ملکوں کی مجموعی آمدنی سے بھی زیادہ ہے، ایک اندازے کے مطابق بینک آف انگلینڈ جیسے دولتمند بینک کی دو تہائی دولت صرف کویت کی جمع کرائی ہوئی رقم سے حاصل ہوتی ہے، اور دوسرے دولت مند عرب ممالک یورپ اور امریکہ کے بینکوں میں جو رقمیں جمع

کراتے ہیں وہ اس کے علاوہ ہیں، یہاں پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اتنی خطیر رقم جس کے بل پر یورپ اور امریکہ نے پوری دنیا میں اپنی ساکھ کا لوہا منوا رکھا ہے، کیا اس سے تجارتی منافع حاصل کرنے کا حق بھی اسی مغربی دنیا کو پہنچتا ہے جس کی دولت کا ایک بہت بڑا مصرف عالم اسلام کی تخریب ہے! سوال یہ ہے کہ یہ رقم خود اپنے ملکوں میں جمع رکھ کر اس سے عالم اسلام کی تعمیر و ترقی کا کام لینے کا انتظام کیوں نہیں کیا جاتا؟ موجودہ حالات میں تو ان کے پاس یہ دولت جمع کرانے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں نکلتا، مغربی ممالک عربوں کا تیل استعمال کرنے کا جو معاوضہ انہیں دیتے ہیں یہ پھر اسے انہیں کی جیب میں ڈال دیتے ہیں کہ تم ہی اس سے نفع اٹھاؤ، اس سے اپنی تجارت و صنعت کو فروغ دو، اسی کے ذریعہ اسرائیل کو طاقت ور بنانے کے لئے اسے جدید ترین اسلحہ مہیا کرو، اور اسی کے ذریعہ ہم پر بمباری کرنے والے طیارے بناتے رہو ـــــ اور جس وقت ہمیں اپنے کسی ترقیاتی کام کے لئے کوئی ضرورت پیش آئے تو اسی کا کچھ حصہ "امداد" کا نام رکھ کر ہمیں واپس کر دو، تاکہ دنیا کے گوشے گوشے میں تمہاری سخاوت اور فیاضی کے قصیدے پڑھے جائیں، اور ہماری گردنیں ہمیشہ تمہارے احسانات کے آگے جھکی رہیں۔

پھر تھوڑا سا اور آگے بڑھ کر دیکھئے جو بچی کھچی رقم یہ ممالک اپنے پاس رکھتے ہیں وہ بھی تھوڑی نہیں ہے لیکن اس کا مصرف کیا ہے؟ ایئر کنڈیشنڈ کاریں، آرائش و زیبائش کا جدید ترین سامان، خود کار فلمیں، شراب، بچوں کے قیمتی کھلونے، ہوا بند ڈبوں کی غذائیں، اور قصیدہ گو شاعر! ـــــ عرب ممالک میں سے بیشتر کا یہ حال ہے کہ وہاں آپ کو گھر گھر ٹیلیویژن اور خود کار فلمیں ملیں گی، سڑکوں پر لاتعداد کیڈی لک کاریں دوڑتی نظر آئیں گی لیکن ان کی چھاؤنیوں میں فوجوں کی تعداد ان کاروں سے کئی گنا کم نظر آئے گی۔ اسلحہ تھوڑا اور وہ بھی پرانے طرز کا ملے گا، انتہا یہ ہے کہ کویت جیسے دولت مند ملک میں فوج کی تعداد کل پانچ ہزار اور طیاروں کی تعداد صرف ۸ ہے۔

کتنے عبرت کا مقام ہے کہ بیس سال سے اسرائیل کا عالم یہ ہے کہ وہاں بچہ بچہ سپاہی بن رہا ہے مگر اہل عرب کی باقاعدہ افواج بھی جدید مشینی جنگ کے ترقی یافتہ طریقوں کی تربیت نہیں رکھتیں، وہاں ملک کی دولت کا بیشتر حصہ دفاعی مقاصد پر صرف ہو رہا ہے اور یہاں ہر ہر فرد اپنی رقم کا بہترین مصرف تفریح، تعیش اور آسائش کو سمجھتا ہے، وہاں جدید ترین اسلحہ کی بھرمار ہو رہی ہے اور یہاں گھر گھر ٹیلیویژن نصب ہیں، وہاں ٹینکوں کو مضبوط سے مضبوط تر بنایا جا رہا ہے،

اور یہاں کاروں میں ائرکینڈیشنر لگانے کا شوق بڑھ رہا ہے۔ وہاں صنعتی اور تیکنیکی میدان میں ترقی کے لئے شب و روز کوششیں ہو رہی ہیں، اور یہاں ترقی و خوش حالی کا معیار رقص و سرود کو سمجھ لیا گیا ہے۔ وہاں مختلف اور متحارب جماعتیں اسلام کو مٹانے کے لئے متحد ہو رہی ہیں، اور یہاں ابھی تک یہی طے نہیں ہو سکا کہ اتحاد کی بنیاد کیا ہو؟ خدا را سوچئے کہ ایسے حالات میں ہمیں اپنی شکست کا شکوہ کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے؟

(۴) اس شکست کا چوتھا اہم سبب یہ ہے کہ ہم نے اتحاد عالم اسلامی کی کوشش کرنے کے بجائے دوسروں پر بھروسہ کرنے کو ضروری خیال کر لیا ہے، بجائے اس کے انڈونیشیا سے مراکش تک پورا عالم اسلام متحد ہو کر اپنے مسائل خود حل کرنے کی کوشش کرتا، آج اس کی نگاہیں کبھی روس اور کبھی امریکہ کی طرف مرکوز رہتی ہیں، حالاں کہ قدم قدم پر ان طاقتوں کی بے وفائی مشاہدے میں آچکی ہے، موجودہ جنگ میں عربوں کو روس پر اعتماد تھا لیکن اس نے اس دوران جو شرمناک کردار ادا کیا وہ ساری دنیا کے سامنے آچکا ہے، مانا کہ جنگ کے بعد اس کی طرف سے اسرائیل کے خلاف بڑے زور و شور کے بیانات جاری ہوئے۔ اس نے اقوام متحدہ کی نشستوں میں اسرائیل کی مذمت اور عربوں کی حمایت میں کھل کر تقریریں کیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ان ہوائی تقریروں کے ذریعے کب تک دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکی جائے گی؟ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جو شخص دنیا میں جنگل کا قانون نافذ کرنا چاہتا ہو اس کا علاج تقریروں سے نہیں، شمشیروں سے ہوا کرتا ہے، جارحیت کی مذمت زبان سے نہیں، سنگینوں کی نوک سے کی جاتی ہے، اور مظلوم کی فریاد رسی گول میزوں پر نہیں، جنگ کے میدان میں ہوا کرتی ہے ـــــ اگر اخلاق و شرافت اور مسلمہ بین الاقوامی قوانین، اسرائیل کی نگاہ میں کچھ وقعت رکھتے تو آج مشرق وسطیٰ میں فلسطین کا کوئی مسئلہ ہی سرے سے موجود نہ ہوتا۔ وہ ایک زہریلا اژدہا ہے جسے قائل کرنے کے لئے عقل و خرد کی کوئی منطق کارگر نہیں ہو سکتی، اس کا علاج صرف ایک ہے، ایسا بھرپور وار جس کے بعد اسے سر اٹھانے کی جرات نہ ہو سکے۔

میدان کارزار گرم ہونے کے وقت خاموش بیٹھے رہنا، اور مظلوم کا قصہ پاک ہو جانے کے بعد شور مچانا دوستوں کا کام نہیں ہوتا، اور جو مظلوم ایسے شخص کو دوست سمجھنے کی غلطی کرے۔ اس کی سادگی پر اظہار تعجب کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے؟ روس کے اس موجودہ شور و غل کا مقصد بظاہر حالات اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا کہ بالآخر عربوں کو اسرائیل کے ساتھ

سودے بازی (Bargaining) پر آمادہ کر کے بیت المقدس کو بین الاقوامی شہر اور خلیج عقبہ کو بین الاقوامی شاہراہ قرار دے دیا جائے اور اس جنگ میں اسرائیل کی سب سے بڑی کامیابی اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟

عربوں کی شکست کے جو اسباب ہم نے اوپر بیان کئے ہیں ان میں کوئی پیچیدگی، دقت یا ابہام نہیں ہے، یہ کوئی ایسا فلسفہ نہیں ہے جسے سمجھانے کے لئے طویل دلائل کی ضرورت ہو، یہ وہ سامنے کی باتیں ہیں جنہیں آج ہر ذی شعور مسلمان محسوس کر رہا ہے۔

یہ شکست ایک زبردست ٹھوکر ہے جو پورے عالم اسلام کو لگی ہے، یہ قدرت کا ایک تازیانہ ہے جو ہم سب کو بیدار ہونے کی دعوت دے رہا ہے، اور اگر ہم خودکشی کا عزم صمیم کر کے نہیں بیٹھ گئے تو ہمیں ان تمام کوتاہیوں کی تلافی کے لئے کمربستہ ہونا پڑے گا، یاد رکھئے کہ اسرائیلی جارحیت کا سیلاب از خود کسی حد پر رکنے والا نہیں ہے، جب تک کہ عالم اسلام اس پر یہ ثابت نہ کر دے کہ مسلمان ایک ایسی چٹان ہے جس سے ٹکرانا اپنے آپ کو پاش پاش کر ڈالنے کے مترادف ہے، زبانی دعوؤں کا وقت گزر چکا ہے اب عمل کا وقت ہے۔ اور اگر اب بھی ہمیں ہوش نہ آیا تو ہمارا انجام بڑا ہی ہولناک ہو گا۔ آج اسرائیل نے بیت المقدس اور صحرائے سینا پر قبضہ جمایا ہے، کل وہ قاہرہ، دمشق اور بغداد کا رخ کرے گا اور پھر عالم اسلام کا کوئی گوشہ اس قہر الٰہی سے مامون نہ رہ سکے گا۔ (اللہم احفظنا)

اور اگر اس شکست نے ہمیں جہد و عمل پر آمادہ کر دیا تو یہ شکست کچھ مہنگی نہیں ہے، اگر ہم صحیح معنی میں مسلمان بن کر متحد ہو گئے تو اسرائیل کی تو ہستی کیا ہے، دنیا کی کوئی طاقت ہم پر بری نگاہ ڈالنے کی جرات نہ کر سکے گی۔

اے رب العزت! ہمیں اس ٹھوکر سے سنبھل جانے کی صلاحیت عطا فرما، ہمارے ان تمام گناہوں سے درگزر فرما جن کی بدولت ہمیں یہ ذلت نصیب ہوئی، اور آئندہ کے لئے ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم صحیح معنی میں مسلمان بن کر باطل کی طاغوتی قوتوں کا مقابلہ کر سکیں۔ ہمارے افتراق و انتشار کو اتحاد اور اتفاق میں بدل دے، اور یہ قوم جو دو صدیوں سے اپنی قسمت کے پھیر میں آئی ہوئی ہے، اسے ایک بار پھر دنیا میں سربلندی اور آخرت میں سرخ روئی بخش دے، آمین! اللہم آمین۔

عالم اسلام کی بنیادی بیماری

سادگی اپنوں کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بیت المقدس میں اسرائیل کے ناپاک اور غاصبانہ قبضے کو پورا ایک سال بیت گیا۔ اس دوران کوئی اشتعال انگیز کارروائی ایسی نہیں ہے جو جارحیت کے اس عفریت نے سرزمین مقدس پر روا نہ رکھی ہو، اس نے وہاں کے بیکس اور مجبور مسلمانوں پر ظلم و ستم بھی ڈھائے، قبہ الصخرہ کے عین سامنے جبین حیاء کو عرق عرق کر دینے والی شرمناک حرکتیں بھی کیں، بیت المقدس میں فوجی پریڈ کر کے اپنے جارحانہ عزائم کا کھلم کھلا مظاہرہ بھی کیا، غرض وہ سب کچھ کیا جس کی ایک کمینہ خصلت دشمن سے توقع کی جا سکتی تھی، ـــــ لیکن دوسری طرف اپنے آپ کو دیکھئے تو ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ابھی تک یہی طے نہیں کر سکے کہ اس المیے پر غور کرنے کے لئے سربراہوں کو سر جوڑ کر بیٹھنا چاہئے یا نہیں؟ اس سرد مہری کا نتیجہ یہ ہے کہ اسرائیل کی دراز دستیاں بڑھتی چلی جارہی ہیں اور ایک سال کے اس طویل عرصے میں مشترک جوابی اقدام کے لئے ہمارا کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکا، اور اب ۵ جون کو پورے عالم اسلام میں "یوم احتجاج" منانے کی تجویز پیش کی جارہی ہے۔ اس دن سارے عالم اسلام میں اس جارحیت کے خلاف مظاہرے ہوں گے، جلسوں، جلوسوں، تقریروں اور قرار دادوں کے ذریعہ اسرائیلی قبضے کے خلاف احتجاج کیا جائے گا۔ اتنے عظیم سانحے کو بالکل خاموشی کے ساتھ پی جانے سے تو بہرحال یہ بہتر ہے، لیکن اصل معاملے پر اس کا اثر اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ بیت المقدس کے وہ بام و در جنہوں نے کبھی صلاح الدین ایوبی کے غیور سپاہیوں کو بیت المقدس کی آزادی کے لئے آگ اور خون سے کھیلتے دیکھا تھا، ۵ جون کو ہماری "گرم گفتاری" کا بھی نظارہ کر لیں گے۔

گذشتہ سال کے دوران عرب ممالک کے بعض سربراہوں نے بلاشبہ انفرادی طور پر اپنی سی کوششیں جاری رکھی ہیں، لیکن ان کوششوں کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی شخص کے جسم پر بے شمار پھنسیاں نکل آئی ہوں، اور وہ اپنے خون کی اصلاح کی فکر کرنے کے بجائے خارجی دواؤں سے ان پھنسیوں کو دبانا چاہتا ہو، اسرائیل عالم اسلام کے جسم پر ایک رستا ہوا ناسور ہے، اور اس کا علاج صرف اوپر اوپر پاؤڈر چھڑکنے یا مرہم لگانے سے نہیں ہو گا، اگر ان تدبیروں سے یہ زہریلا مادہ دب بھی گیا تو جسم کے کسی اور حصے پر اپنا اثر دکھائے گا۔ لہٰذا ہمارے لئے اصل غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ یہ زہریلا مادہ آخر کیا ہے جو کبھی فلسطین کا مسئلہ لے کر کھڑا ہوتا ہے کبھی قبرص کا، کبھی کشمیر میں اپنا اثر دکھلاتا ہے کبھی حبشہ میں، ہمیں یہ سوچنا ہے کہ اس زہریلے مادہ کی ابتداء کہاں سے ہوئی؟ یہ کیوں ہمارے جسم میں داخل ہوا؟ اور اس سے نجات پانے کی کیا سبیل ہے؟

بات اگرچہ لمبی ہے مگر پیچیدہ ہرگز نہیں، قرآن کریم نے سورۂ نور میں ہم سے یہ وعدہ کیا ہے کہ:۔

وعد الله الذين آمنوا منكم و عملوا الصالحات ليستخلفنهم فی الارض كما استخلف الذين من قبلهم وليمكنن لهم دينهم الذی ارتضی لهم وليبدلنهم من بعد خوفهم امنا يعبدوننی لا يشركون بی شيئا.

”تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح کئے ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ اللہ انہیں زمین میں اپنی خلافت ضرور عطا کرے گا، جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو عطا کی ہے اور جس دین کو ان کے لئے اس نے پسند کیا ہے اسے ضرور قوت عطا کرے گا۔ اور ان کے خوف کو یقیناً امن سے بدل دے گا، (بس) وہ میری عبادت کریں، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔“

اگر ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اس کائنات کا خالق و مالک خدا ہے، اور یہاں کوئی ذرہ اس کے حکم کے بغیر نہیں ہلتا۔ دنیا میں جتنے انقلابات آتے ہیں، زمانہ جتنی کروٹیں بدلتا ہے روئے زمین پر جتنے تغیرات رونما ہوتے ہیں وہ سب اسی کے حکم اور مشیت کے تحت ہوتے ہیں،

اگر ہمارا اس بات پر ایمان ہے کہ قرآن اس کا سچا کلام ہے اور اس کا کوئی لفظ غلط نہیں ہو سکتا تو پھر ہمیں پوری سنجیدگی کے ساتھ اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ ہمارے حق میں قرآن کریم کا یہ وعدہ کیوں پورا نہیں ہو رہا؟ ہمیں زمین میں قوت کیوں حاصل نہیں؟ ہمارا خوف امن سے کیوں نہیں بدلتا؟ کیا معاذ اللہ خداوند کریم کا یہ وعدہ محض ایک بہلاوہ ہے؟ آپ ذرا انصاف کے ساتھ غور فرمائیں گے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالٰی کا یہ وعدہ اپنی جگہ اٹل ہے، اور تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں دنیا اس کی صداقت کے کرشمے دیکھ چکی ہے، آج اگر ہمیں مصائب و آلام کا سامنا ہے تو یہ درحقیقت اس "ایمان" اور "عمل صالح" کی کمی ہے جسے قرآن کریم میں اس وعدے کے لئے لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔

آپ اگر ماضی قریب ہی کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے تو اس حقیقت کا آشکار ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔

ہمارے اجتماعی المیہ کی ابتداء دراصل خلافت عثمانیہ (ترکی) کے خاتمے سے ہوئی ہے۔ اس وقت عالم اسلام کو جتنے مصائب و آلام درپیش ہیں، وہ درحقیقت اس جال میں پھنسنے کے لازمی نتائج ہیں جو دشمنان اسلام نے ہم پر بڑی عیاری کے ساتھ ڈالا تھا اور جسے ہم نے خوش نما لباس سمجھ کر خوشی سے پہن لیا۔ یہ جال وہ "مغربی نظام تعلیم" تھا جو بقول لارڈ میکالے لایا ہی اس لئے گیا تھا کہ اس کے ذریعہ مسلمانوں میں ایک ایسی نسل تیار کی جائے جو اپنے رنگ و نسل کے لحاظ سے خواہ کچھ رہی ہو، لیکن اپنی ذہنیت، اپنی فکر اور اپنی معاشرت کے لحاظ سے سو فی صد انگریز ہو۔ کہنے کو تو یہ بات بڑی خوش آئند تھی کہ مسلمان ان علوم و فنون سے آشنا ہو رہے ہیں جنہوں نے یورپ میں نشاۃ ثانیہ حاصل کی تھی لیکن درحقیقت جس اسلوب پر اس نظام تعلیم کو ڈھالا گیا تھا اس نے نوجوانوں کی فکر و نظر کے زاویئے ہی یکسر بدل دیئے، ان کو اپنے گھر کے نظریہ حیات سے بالکل ناواقف رکھا گیا، اور مغرب کے نظریات کی محبت و عظمت ان کے دلوں میں جاگزیں کر دی گئی، چنانچہ ان کی نظر میں زندگی کی قدریں ہی یکسر بدل گئیں، اور "دین" جس میں ان کی فلاح و بہبود کے لئے سب کچھ تھا، یا تو انہیں ایک ڈھونگ نظر آنے لگا، یا زیادہ سے زیادہ اسلاف کا ایک مقدس ورثہ بن کر رہ گیا جس کا عملی زندگی میں کوئی دخل نہیں تھا۔

اس ذہنیت نے جو زہریلے اثرات مسلمانوں میں پھیلائے ان کی فہرست بہت طویل ہے، لیکن انہیں میں سے ایک مہلک ترین اثر "قومیت" اور "وطنیت" کا وہ تصور تھا جس نے

بالآخر مسلمانوں کے ناقابل تسخیر اتحاد کو پاش پاش کر کے رکھ دیا، دشمنان اسلام بارہا آزما چکے تھے کہ مسلمانوں کا اتحاد ان کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، چنانچہ انہوں نے اپنے نظام تعلیم کے ذریعے "قومیت" کے وطنی تصور کی اس شان سے تبلیغ شروع کی کہ گویا اس نظریئے کو اختیار کئے بغیر کسی انسان کا "مہذب" قرار پانا ممکن ہی نہیں ہے وہ نوجوان جو مغربی نظام تعلیم سے متاثر ہو کر مغرب کی ہر آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہتے تھے، انہوں نے اس نظریئے کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور اپنے ہاتھوں سے اس جال کے پھندے تیار کئے جو خود ان کے لئے بنا جا رہا تھا۔

عرب میں نظریہ وطنیت (Nationalism) کی تاریخ کا اگر آپ مطالعہ فرمائیں تو معلوم ہو گا کہ وہاں اس نظریئے کے اولین بانی تمام تر عیسائی اور یہودی تھے۔ عہد حاضر کے معروف مستشرق فلپ کے۔ ہٹی اپنی کتاب "اسلام اور مغرب" میں لکھتے ہیں "یہ بنیادی طور سے سوریا اور لبنان کے عیسائی ہی تھے جنہوں نے اس مغربی متاع (نظریہ قومیت) سے مصالحت کی ان کے شاعروں اور صحافیوں نے جو مصر پر برطانیہ کے قبضے کے دوران نسبتہً زیادہ آزادی کے ساتھ لکھتے تھے، وہ چنگاری پیدا کی جس نے نیشنلزم کے شعلے کو بھڑکایا۔ اس نظریئے کے نئے تصورات مثلاً حب وطن، قوم، بابائے وطن، اور انسانی حقوق کے لئے انہوں نے نئے الفاظ گھڑے یا پرانے الفاظ میں ترمیم کی اس لئے خلافت عثمانیہ کے جوئے سے آزاد ہونا دراصل نظریئے قومیت کی پیدائش پر موقوف تھا۔ (Islam and the west, New york 1962. P,91) نیز عرب کے ماضی قریب کے مورخ جارج انٹونیس (George Antonius) اپنی کتاب "عربوں کی بیداری (The Arab Awakening) میں مزید وضاحت اور تفصیل کے ساتھ لکھتا ہے۔

> "عرب میں قومی تحریک کی پہلی منظم کوشش سلطان عبدالحمید کی تخت نشینی سے دو سال پہلے ۱۸۷۵ء میں شروع ہوئی جب کہ پانچ نوجوانوں نے جو بیروت میں سیرین پروٹسٹنٹ کالج کے پڑھے ہوئے تھے، ایک خفیہ سوسائٹی قائم کی، یہ سب عیسائی تھے، لیکن انہوں نے مسلمانوں اور دروزوں کو شامل کرنے کی اہمیت محسوس کی اور کچھ ہی عرصے میں مختلف مذاہب کی تقریباً بائیس افراد کو اپنا ممبر بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

آگے چل کر جارج انٹونیوس نے بتایا ہے کہ جن لوگوں نے عرب قومیت کی تحریک کو آگے بڑھایا ان میں دو آدمی سب سے زیادہ نمایاں تھے، ایک ناصف یا زجی اور دوسرے بطرس بستانی۔ یہ دونوں لبنان کے عیسائی تھے، بستانی ہی نے سب سے پہلے اس نعرہ کو چلایا کہ:

حب الوطن من الایمان

"وطن کی محبت جزو ایمان ہے"

جب کہ اس سے قبل عرب اس نعرے سے واقف نہ تھے، مصنف نے تفصیل سے بتایا ہے کہ شروع میں مسلمانوں نے اس تحریک کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا، مگر رفتہ رفتہ وہ بھی اس سے متفق ہوتے چلے گئے، اور جارج انٹونیوس کے الفاظ میں:

("So it came to pass that the ideas which had originally been sown by the chirstians were now - roughly at the - turn of the century - finding an increasingly receptive soil among the Muslim")

"اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نظریات جن کے بیج دراصل عیسائیوں نے بوئے تھے، اب (یعنی قریب قریب اس صدی کی ابتداء میں) ان کو مسلمانوں کے درمیان ایسی زمین مل گئی جو روز افزوں اثر پذیر تھی۔"

اسی طرح "ترک نوجوانوں" میں بھی اسی تعلیم کے اثرات نے ترکی قومیت کا بت کھڑا کیا۔ یہاں بھی نظریہ قومیت کے بانی عیسائی تھے۔ ترکی کی مشہور مصنفہ خالدہ ادیب خانم اپنی کتاب ("Conflict of East and West in Turkey")میں لکھتی ہیں کہ "ایک طرف ترکی کے نوجوان مسلمان جمہوریت کا نعرہ لے کر کھڑے ہوئے، اور دوسری طرف سلطنت عثمانیہ کے عیسائی باشندے نیشنلزم کو چمٹے ہوئے تھے۔" (ص ۵۱)

اس طرح انہوں نے عربوں اور ترکوں کو ایک دوسرے کے خلاف ابھار کر باہم برسرپیکار کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عالم اسلام جو کبھی خلافت عثمانیہ کے تحت ایک جسم کی طرح تھا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر رہ گیا، پھر ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو بھی عرصہ دراز تک اپنے زیر انتداب رکھنے کے بعد کہنے کو تو دشمنان اسلام نے انہیں آزاد کر دیا لیکن چوں کہ نئی تعلیم پائے ہوئے مسلمانوں کے ذہن ہی یکسر بدل چکے تھے اس لئے ذہنی اور عملی طور سے وہ

درحقیقت ہمیشہ کے لئے مغرب کے "زیر انتداب" ہو کر رہ گئے لارڈ کرومر (Lord Cromer) اپنی کتاب "مصر جدید" (Modern Egypt) میں انگریزوں کے طرز عمل کی بالکل صحیح ترجمانی کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"انگلینڈ اس بات کے لئے تیار تھا کہ اپنے تمام استعماری مقبوضات کو جس قدر جلد ممکن ہو آزادی عطا کر دے کیوں کہ ایسے دانشوروں اور سیاست دانوں کی ایک نسل ان ممالک میں پیدا ہو چکی تھی جو انگریزی تعلیم اور انگریزی ثقافت سے بہرہ ور ہو کر ان ملکوں کو سنبھالنے کے لئے تیار تھے لیکن:

(Under no circumstances would the British Government for a single moment to cerate an indepe-ndent Islamic state")

"برطانوی حکومت کسی بھی حال میں ایک لمحے کے لئے بھی کسی آزاد اور خود مختار اسلامی حکومت کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔"

مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا یہ جال جو سالہا سال کی محنت سے تیار کیا گیا تھا، بالآخر بار آور ہوا، اور اول تو اسلامی ممالک چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر خود بخود ہی کمزور ہو گئے، پھر یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی ذہنی اور عملی طور پر اپنے دین سے دور اور بہت دور چلے گئے۔ اب مغربی اقوام ان سے اپنی من مانی خواہشات پوری کرانے کے لئے بالکل آزاد تھیں، انہوں نے جس کو چاہا ظاہری طور سے بھی غلام بنایا اور جس کو چاہا اپنی خود غرضانہ شرائط پر نام کی آزادی عطا کی، اور اسے ہمیشہ کے لئے کسی ایسے مسئلہ میں الجھا دیا کہ جس سے کبھی باہر نہ نکل سکے۔

یہی وہ مقصد تھا جو خلافت عثمانیہ کے باقی رہتے ہوئے یہ مغربی قومیں کبھی حاصل نہ کر سکتی تھیں، کیوں کہ خلافت عثمانیہ اپنے گئے گزرے دور میں بھی مسلمانوں کا ایک مشترکہ حصار تھا،

اور اس کی موجودگی میں کسی کو ان کے حقوق غصب کرنے کی جرات مشکل ہی سے ہوتی تھی۔

فلسطین کے مسئلے ہی کو دیکھ لیجئے اس علاقہ پر تو سالہا سال سے یہودیوں کا دانت تھا، یہی وجہ ہے کہ جب برطانیہ نے انہیں آباد ہونے کے لئے یوگنڈا کے ایک علاقے کی پیش کش کی تو یہودیوں نے اسے نامنظور کر دیا تھا اور وہاں آباد ہونے کے بجائے انہوں نے ۱۹۰۲ء میں تھیوڈور ہرزل (Theodore Herzl) کو قائد بنا کر ایک وفد خلافت عثمانیہ کے فرمانروا سلطان عبدالحمید ثانی کی خدمت میں بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ یہودیوں کو دوبارہ فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دی جائے، اور ساتھ ہی یہ پیش کش کی کہ اس "اجازت" کے صلے میں ہم ترکی حکومت کے بیرونی قرضے ادا کرنے کے لئے تیار ہیں۔

لیکن سلطان عبدالحمید ثانی نے اس درخواست کا جو جواب دیا وہ عرب نیشنلزم کے ان دلدادگان کے لئے سرمہ بصیرت ہے جو ترکی خلافت کو اپنا سب سے بڑا دشمن خیال کرتے ہیں۔ تھیوڈور ہرزل اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ سلطان عبدالحمید کا جواب یہ تھا:

> "ڈاکٹر ہرزل کو باخبر کر دو کہ وہ آج کے بعد فلسطین میں یہودی ریاست قائم کرنے کی کوشش سے دستبردار ہو جائیں، یہودی فلسطین کو صرف اس صورت میں حاصل کر سکتے ہیں جب کہ خلافت عثمانیہ ایک خواب و خیال ہو چکی ہو۔"

(Quoted by Mr. Ghulam Mohmmad: of Indone
sia Muslim news Karachi May 1968 p. 8)

سلطان عبدالحمید کے اس جواب سے لوگ اس بات سے تو قطعی طور پر مایوس ہو گئے کہ خلافت عثمانیہ کی موجودگی میں فلسطین پر قبضہ جمانے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے، البتہ اس کے بعد انہوں نے خلافت عثمانیہ پر ضرب لگانے کی بھرپور کوششیں شروع کر دیں اور مغربی نظام تعلیم اور اس کے پھیلائے ہوئے قومی اور لادینی نظریات کے بل پر انہوں نے اس مقصد میں پوری کامیابی حاصل کی۔ خلافت عثمانیہ واقعتہً خواب و خیال ہوئی، اور اس کا نتیجہ اسرائیل کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اور ایک اسرائیل ہی کیا، عالم اسلام کے تمام اجتماعی مسائل واقعات کے اسی تسلسل کی پیداوار ہیں۔

ان طویل گذارشات سے ہمارا مقصد اس بات کی طرف توجہ دلانا ہے کہ اگر ہم واقعتہً ان مصائب و آفات سے رہائی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے اس طرز فکر و عمل پر پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ نظرثانی کرنی پڑے گی جو ہم نے تقریباً ڈیڑھ سو سال سے اختیار کیا ہوا ہے، ہمارا اصل مسئلہ مغرب کی وہ اندھی تقلید ہے جس نے ہمارے پورے نظام زندگی کو تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے جس کی وجہ سے ہم "ایمان" اور "عمل صالح" کی اس دولت سے محروم ہوتے جارہے ہیں، جو قرآن کریم کی تصریح کے مطابق ہماری قوت و شوکت کا اصل سرچشمہ ہے، ہماری مثال اس بھٹکے ہوئے مسافر کی سی ہے جو اپنی منزل کا راستہ بھول کر کسی "پیر تسمہ پا" کے پیچھے لگ گیا ہو، یہ "پیر تسمہ پا" ہمارے کاندھے پر سوار ہو کر ہمیں مسلسل ان راستوں پر چلا رہا ہے جو ہمارے لئے ہلاکت اور تباہی کے راستے ہیں لیکن ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ہلاکت کے کسی گڑھے میں گرنے کے بعد ہم پھر راستہ اسی "پیر تسمہ پا" سے پوچھتے ہیں۔ اور وہ تباہی کے ایک نئے غار کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔

افسوس ہے کہ عالم اسلام میں ابھی اس حقیقت کا شعور نہایت ہی ست ہے۔ گذشتہ سال اسرائیل کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد ہمیں ہوش آ جانا چاہئے تھا، لیکن قبلہ اول کے چھن جانے سے زیادہ کرب انگیز بات یہ ہے کہ ہم نے اب تک اس حادثے سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ ہماری ــــ اور بالخصوص عرب ممالک کی ــــ زندگی کا پہیہ بدستور اسی ڈھب پر گھوم رہا ہے۔ دین سے بے رخی کا وہی عالم ہے، تقلید مغرب کے ولولے دلوں پر اس طرح حکمراں ہیں، عیش و عشرت کا شوق اسی طرح چٹکیاں لے رہا ہے، جفاکشی اور محنت کوشی کا جذبہ اسی طرح کوسوں دور ہے، اللہ اور اسلام کے بجائے "عرب قومیت" اور "مادر وطن" کے نعرے اسی زور و شور سے لگ رہے ہیں اور باہمی نااتفاقی نے ہمیں اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے کیا ہوا ہے۔

ہماری گذارش یہ ہے کہ ۵ جون کو یہودیوں کی جارحیت کے خلاف احتجاج کرنے کے ساتھ اپنی اس بیمار ذہنیت کے خلاف بھی احتجاج کیجئے جس نے یہود جیسی قوم کو ہم پر بری نگاہ ڈالنے کی جرات عطا کی ہے، اسرائیلی قبضہ کے خلاف قرار دادیں منظور کرنے کے ساتھ اس "قبضے" کے خلاف بھی قرار دادیں منظور کیجئے جو اسرائیل کا ناپاک تخم بونے والوں نے ہمارے ذہنوں اور دلوں پر جمایا ہوا ہے۔ فلسطین کو اجنبی تسلط سے آزاد کرانے کے عزم کے ساتھ اس بات کا عزم بھی تازہ کیجئے کہ اپنے افکار کو ان اجنبی اثرات سے آزاد کریں گے جنھوں نے ہمیں اپنے

دین، اپنے ایمان، اور اپنی صراط مستقیم سے بھٹکا کر بے دینی، نفس پرستی، عیش کوشی اور غفلت شعاری کی راہ پر ڈال دیا ہے۔ اور جس کی وجہ سے ہم غیروں کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن کر رہ گئے ہیں۔ جب تک ہم "تقلید مغرب" کے اس زہریلے مادے کو جرات کر کے ختم نہیں کریں گے اس وقت تک "اسرائیل" جیسے ناسور اٹھتے رہیں گے۔ اور وقتی تدبیریں ہمارے الجھے ہوئے مسائل کو حل نہیں کر سکیں گی۔

پچھلے دنوں مفتی اعظم فلسطین نے راولپنڈی کی ایک تقریر میں کہا تھا کہ خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد عالم اسلام کی نگاہیں پاکستان کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اور دینا بھر کے مسلمان پاکستان کو اپنی امنگوں اور آرزوں کا مرکز سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ تنہا ایک ریاست ہے جو صرف اسلام کے نام پر قائم ہوئی ہے۔ مفتی صاحب کا یہ مطالعہ بالکل درست ہے، اور یہ پاکستان کے عوام اور حکام کا فریضہ ہے کہ وہ ماضی کے تلخ تجربات سے سبق لے کر دنیا بھر کے مسلمانوں کی ان توقعات کو پورا کریں، اور تقلید مغرب کے پامال راستے پر چلنے کی بجائے اپنے لئے اسلام کی بتائی ہوئی وہ راہیں اختیار کریں جو نہ صرف پاکستان کو صلاح و فلاح سے ہمکنار کرنے والی ہوں، بلکہ دوسرے اسلامی ممالک کو بھی موجودہ دلدل سے نکال کر امن و سکون عطا کر سکیں۔

و ما علینا الا البلاغ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلے مہینے پاکستان میں دنیائے اسلام کے سربراہوں کی کانفرنس منعقد ہو رہی ہے یہ ایک تاریخی اعزاز ہے جو پہلی بار پاکستان کو حاصل ہو رہا ہے اور کوئی شک نہیں کہ یہ اقدام موجودہ حکومت کے لئے باعث صد افتخار اور قابل صد مبارک باد ہے۔

پچھلی چند صدیوں سے مسلمان اپنی قسمت کے جس المناک پھیر میں مبتلا ہیں اس کے اسباب پر اب تک بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے لیکن اس معاملے میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ کے دو جملے اپنے اختصار اور جامعیت کے پیش نظر آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔ یہ وہ خدا مست بزرگ ہیں' جنہوں نے سالہا سال تک دارالعلوم دیوبند کی چٹائیوں پر قال اللہ وقال الرسول ؐ کا درس دیا لیکن جب برصغیر کو انگریز کی غلامی سے نجات دلانے کی آرزو نے انہیں بے چین کیا تو انہوں نے دارالعلوم کے اسی بوریئے پر بیٹھ کر آزادی ہند کی عظیم تحریک چلائی جس کا ایک سرا کابل میں اور دوسرا قسطنطنیہ میں تھا اسی تحریک کی پاداش میں انہیں تین سال مالٹا کی قید میں گذارنے پڑے۔

راقم الحروف کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم العالی بیان فرماتے ہیں کہ مالٹا کی اسیری سے واپس آنے کے بعد ایک دن حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ و طلباء کی ایک مجلس میں تشریف فرما تھے، وہاں آپ نے ارشاد فرمایا کہ

"ہم نے اپنی پوری زندگی میں ایک سبق سیکھا ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے زوال کے دو سبب ہیں ایک ان کا قرآن کریم کو چھوڑ دینا اور دوسرے ان کا باہمی اختلاف اور افتراق، اب میری زندگی کا مشن

یہ ہو گا کہ ان دو اسباب کو زائل کرنے کی فکر کی جائے۔ قرآن کریم کی تعلیم و تبلیغ اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے میں اپنی ساری توانائیاں صرف کی جائیں۔"

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ پر جتنا غور و فکر کیجئے، ان کے اسباب زوال کا خلاصہ یہی چیزیں ہیں اور اگر اب بھی کبھی صلاح و فلاح مسلمانوں کا مقدر ہے تو اس کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے کہ ان دو اسباب کا ازالہ کیا جائے۔

دشمنان اسلام نے تاریخ کے ہر دور میں اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کی کوشش کی ہے اور اس مقصد کے لئے ہر ممکن حربہ آزمایا ہے۔ شروع میں انہوں نے تلوار کے زور سے مسلمانوں کو دبانے اور مٹانے کی کوشش کی کی اور مختلف اور متضاد عناصر نے جمع ہو ہو کر مسلمانوں پر حملے کئے لیکن اللہ تعالیٰ نے ملت اسلامیہ کی متحد قوت کو ایسا ناقابل تسخیر بنا دیا تھا کہ مخالف طاقتیں ان سے ٹکرا کر اپنا سر توڑنے کے سوا کچھ حاصل نہ کر سکیں۔ اس کے بعد انہوں نے دلیل و بحث کے راستے سے مسلمانوں کو شکست دینے کی کوشش کی لیکن ظاہر ہے کہ حجت و برہان کے میدان میں اسلام کے سامنے کون ٹھہر سکتا تھا؟ اس پہلو سے بھی دشمنوں نے منہ کی کھائی اور مسلمانوں کا بال بیکا نہ ہو سکا۔

اس کے بعد دشمنان اسلام نے جو تدبیر اختیار کی وہ ایسی زہریلی تھی کہ اس کا داؤ مسلمانوں پر چل گیا اور آج تک اس کے چنگل سے نہیں نکل سکے۔ وہ تدبیر یہ تھی کہ مسلمان کو قرآن و سنت کی تعلیمات سے برگشتہ کر کے ان میں نسل و رنگ کے فتنے جگائے جائیں اور زبان و وطن کی بنیاد پر انہیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر دیا جائے چنانچہ عالم اسلام میں اندرونی طور پر سازشیں کر کے دو منصوبے ایک ساتھ شروع کئے گئے ایک طرف تو مسلمانوں میں ایک ایسا نظام تعلیم جاری کیا گیا جس میں خدا بیزاری اور دین فراموشی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور دوسری طرف ایک خطے کے مسلمانوں کو دوسرے خطے کے مسلمانوں کے خلاف نسل و وطن کی بنیاد پر بھڑکایا گیا۔ خلافت عثمانیہ آخری دور میں اپنی کمزوریوں کے باوجود مسلمانوں کا ایک مستحکم حصار تھا جس پر بری نظر ڈالنے سے پہلے دشمنوں کو جھرجھری ضرور آ جاتی تھی لیکن جب اندرونی سازشوں نے ان میں ترکی اور عربی کا سوال کھڑا کیا تو باہمی خانہ جنگیوں نے اس ناقابل تسخیر چٹان کو ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ جو چھوٹے چھوٹے خطے خلافت کے دور میں معمولی اضلاع کی حیثیت رکھتے تھے اب وہ سب مستقل ریاستوں میں تبدیل ہو گئے جن کے درمیان

چھوٹی چھوٹی باتوں پر نہ ختم ہونے والے نزاعات قائم تھے اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا کہ پوری دنیائے اسلام، جس سے کبھی دنیا کی عظیم طاقتیں لرزہ براندام تھیں اب مغربی مفادات کی ایسی شکار گاہ بن چکی ہے جس پر مسلمانوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

اس گئے گزرے دور میں بھی، جب کہ ساری دنیا میں مسلمانوں کے زوال کا رونا رویا جا رہا ہے مسلمانوں کو ایسے زبردست وسائل میسر ہیں کہ شاید پوری تاریخ اسلام میں ان کی نظیر نہ ہو دنیا کے نقشے پر ایک نظر ڈال کر دیکھئے کہ قدرت نے اسلامی ملکوں کو ایک طرح جغرافیائی زنجیر میں پرویا ہوا ہے۔ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک تقریباً تمام مسلمان ریاستوں کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ پھر قدرت نے اس کرۂ زمین پر انہیں جو خطہ عطا کیا ہے اسے پوری دنیا کا دل کہنا چاہئے، دنیا کی اہم ترین شاہراہیں ان کے قبضے میں ہیں معدنی وسائل کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے انہیں ساری دنیا میں ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے۔ بیسویں صدی کی زندگی کا دارومدار تیل پر ہے اور اس علاقے میں انہیں اس زر سیال پر اجارہ اری حاصل ہے۔ یہاں تک کہ یہ مقولہ مشہور ہو گیا ہے کہ "جہاں مسلمان ہے وہاں تیل ہے" اور گزشتہ چند مہینوں میں دنیا نے دیکھ لیا کہ تیل کی سپلائی میں معمولی سا فرق کر کے بعض عرب ممالک نے پورے مغرب کو کس سنگین بحران میں مبتلا کر دیا ہے۔

انسانی وسائل کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی عالم اسلام انتہائی مالا مال نظر آتا ہے ہم پوری دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہیں اس وقت دنیا میں جتنی سیاسی جتھ بندیاں قائم ہیں ان میں سے کوئی عددی حیثیت سے مسلمانوں کی ہمسری نہیں کر سکتی۔ امریکہ ہو یا روس یا افریقی اتحاد یہ سب کے سب آبادی میں ہم سے فروتر ہیں صرف چین ایک ایسا ملک ہے جو آبادی کے اعتبار سے مسلمانوں کے برابر ہے لیکن رقبہ کے اعتبار سے مسلمانوں کو چین پر بھی فوقیت حاصل ہے پھر یہ عظیم آبادی بھی دنیا کے ان حصوں میں واقع ہے جو ہمیشہ تاریخ کی انقلابی تہذیبوں کا گہوارہ رہے ہیں اور جہاں کے باشندوں نے دنیا بھر سے جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔

لیکن قدرتی وسائل کی اس ریل پیل کے باوجود اس وقت حالت یہ ہے کہ شاید پوری دنیا میں مسلمانوں سے زیادہ بے اختیار، بے وزن اور مجبور و مقہور قوم کوئی نہ ہو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان میں کوئی اتحاد اور یکجہتی نہیں پائی جاتی۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ اقوام متحدہ

میں مسلمان ممالک کی تعداد بھی چالیس کے لگ بھگ ہے اور افریقی ممالک کی تعداد بھی تقریباً اتنی ہے لیکن افریقی اتحاد کا وزن پوری دنیا محسوس کرتی ہے اور وہ بسا اوقات اقوام متحدہ سے اپنی بات منوا لینے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمان ممالک اپنی اتنی بڑی تعداد کے باوجود اس عالمی ادارے میں ایسی ناقابل لحاظ اکائیوں کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی بات میں کوئی وزن اور کوئی وقعت نہیں ہے اس کا سبب صرف اور صرف یہی ہے کہ ان کے درمیان کوئی سیاسی وحدت قائم نہیں ہے بلکہ دشمنوں نے انہیں چھوٹی چھوٹی ٹکریوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے سے برسرپیکار کر رکھا ہے۔

یہ صورت حال بالکل واضح ہے اور اس کی تشریح کے لئے کسی لمبے چوڑے فلسفے کی ضرورت نہیں ہے یہ عالم اسلام کے سربراہوں کی ذمہ داری تھی کہ ۔۔ دشمنان اسلام کی اس چال کو سمجھ کر اس کا توڑ تیار کرنے کی فکر کرتے اگر بیس پچیس سال پہلے مسلمانوں نے اس ضرورت کو کماحقہ محسوس کر کے عالم اسلام کے اتحاد کی داغ بیل ڈال دی ہوتی تو آج کرہ زمین کا نقشہ بدلا ہوا ہوتا۔ آج جو اسلامی ممالک کبھی امریکہ، کبھی روس اور کبھی چین کی پناہ لینے پر مجبور ہیں۔ دنیا بھر کے مظلوموں کی پناہ گاہ بنتے اور دنیائے اسلام کے جسم پر سے اسرائیل اور بھارت جیسے ناسور پیدا نہ ہو سکتے۔

بہرکیف! بہت دیر کے بعد سہی، اب جو مسلم سربراہ کانفرنس منعقد ہو رہی ہے وہ سالہا سال تک اندھیروں میں بھٹکنے کے بعد پہلا صحیح قدم ہے جو مسلمان ممالک کی طرف سے اٹھایا گیا ہے اور خاص طور سے پاکستان کے لئے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ اس کانفرنس کے انعقاد کے لئے بھی اسی کو منتخب کیا گیا ہے اور اس کے داعی اور منتظم کی حیثیت بھی اسی کو حاصل ہے۔

اس وقت اس میں شک نہیں کہ دشمنان اسلام کی ساری توانائیاں اس کانفرنس پر سازشوں کا جال ڈالنے میں صرف ہو رہی ہونگی۔ اس لئے مسلم سربراہوں کو اس موقعہ پر ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا پڑے گا لیکن اگر مقصد کی خاطر خواہ اہمیت اور اس کی مخلصانہ لگن موجود ہو تو یہ کانفرنس تاریخ کے دھارے کو موڑ سکتی ہے۔ اس اجتماع کا شرکاء کا یہ فریضہ ہے کہ ۔۔ اسے محض "نشستند و گفتند و برخاستند" پر ختم نہ کر دیں، بلکہ اس میں اتحاد عالم اسلامی کے لئے ایسے پائیدار اقدامات کا فیصلہ کر کے اٹھیں جو مسلمانوں میں اپنی قومی خودداری اور ملی قوت کا صحیح

احساس پیدا کر کے ان میں ایک نئی زندگی کی روح پھونک سکیں جن کے ذریعہ اسلامی ممالک کے باہمی تنازعات کا منصفانہ تصفیہ ہو سکے اور اس کے بعد عالم اسلام اپنا وہ کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکے جس کا وہ مستحق ہے۔

اس وقت دنیا بھر کے مسلمانوں کی نگاہیں اس تاریخی کانفرنس پر مرکوز ہیں، کروڑوں سادہ دل فرزندان توحید نے اس اجتماع سے خوشگوار امیدیں وابستہ کی ہوئی ہیں اس کانفرنس کے شرکاء کا فریضہ ہے کہ وہ ان امیدوں کا پاس کر کے دنیائے اسلام کو مایوسی سے بچائیں اگر خدانخواستہ یہ کانفرنس نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی تو نہ صرف ان مظلوم و مقہور مسلمانوں کی آرزوؤں کا خون ہو گا جو غیر مسلموں کے پنجہ استبداد میں گرفتار ہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام پر مایوسی کا اندھیرا اور گہرا ہو جائے گا۔

اس موقعہ پر عام مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ پوری توجہ اور خشوع و خضوع کے ساتھ ان دعاؤں کا اہتمام کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کانفرنس کو پورے عالم اسلام کے لئے مبارک و مسعود بنائے اس کے ذریعہ مسلمانوں میں اتحاد اتفاق پیدا کر کے انہیں غیروں کی غلامی سے نجات عطا فرمائے اور اس کے شرکاء کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ دشمنوں کی سازشوں سے بچتے ہوئے ایسے فیصلے کر سکیں جو اسلام اور مسلمانوں کے حق میں صلاح و فلاح کے ضامن ہوں۔ (آمین)

مسلم سربراہ کانفرنس

ایک خوشگوار اور تاریخ ساز اجتماع

پچھلے مہینے لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ یہ تاریخ ساز اجتماع ہم سب کے لئے کئی حیثیتوں سے باعث مسرت اور قابل مبارکباد تھا۔ اول تو خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد سے مسلمان جس افتراق و انتشار، باہمی خانہ جنگی اور علاقائی مفادات کی نفسی نفسی میں مبتلا رہے ہیں۔ اس کے پیش نظر یہ بات بہت مشکل نظر آنے لگی تھی کہ مسلمان ممالک کے سربراہ کبھی سرجوڑ کر بیٹھ سکیں گے اس لئے موجودہ حالات میں ان رہنماؤں کا ایک چھت کے نیچے جمع ہو کر بیٹھنا ہی ایک ایسا خوش گوار واقعہ ہے جس نے مایوسی کے گہرے اندھیرے میں امید کی مشعلیں روشن کی ہیں اور ان اسی کروڑ مسلمانوں کی ڈھارس بندھالی ہے جو سالہا سال سے دل شکستگی کا شکار ہیں۔

بادشاہی مسجد لاہور نے بہت سے مسلمان بادشاہوں اور سربراہوں کو اپنی سیڑھیوں پر اترتے چڑھتے دیکھا ہے لیکن ۲۲ فروری کو اڑتیس مسلمان سربراہوں کا بیک وقت بارگاہ الٰہی میں سربسجود ہونا ایک ایسا روح پرور نظارہ تھا جس پر اورنگزیب عالمگیر (رحمتہ اللہ علیہ) کی روح بھی وجد کر اٹھی ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان اڑتیس سربراہوں کے پیکر میں اسی کروڑ مسلمان اپنے مالک و خالق کی بارگاہ میں دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی حالت زار پر نظر فرمائے انہیں سلامت فکر کے ساتھ اپنے نفع و نقصان کو سوچنے اور ہدایت کے راستوں پر چلنے کی توفیق بخشے آمین ثم آمین۔

پھر دوسری خوشی کی بات یہ تھی کہ اس تاریخی اجتماع کے انتظام کی سعادت پاکستان کو حاصل ہوئی اور اس کے پرکیف نظاروں کا اہل پاکستان نے اپنی آنکھوں سے نظارہ کیا اور

تیسری خوشی کی بات یہ ہے کہ اڑتیس سربراہوں کے استقبال، میزبانی اور تحفظ کا انتظام موجودہ حالات میں ایک انتہائی کٹھن مرحلہ تھا۔ بالخصوص جبکہ دنیا کی تمام اسلام دشمن طاقتیں اس کانفرنس کو ناکام بنانے اور اسے زک پہنچانے کے درپے تھیں لیکن محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اس دشوار کام کو بہترین طریقے سے انجام تک پہنچایا۔ حکومت نے اس کانفرنس میں جس غیر معمولی نظم و ضبط، خوش سلیقگی اور حسن اہتمام کا مظاہرہ کیا اور عوام نے جس جوش و خروش اور ہوش مندی کے ساتھ اپنے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اس پر اہل پاکستان بلاشبہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

چوتھی مسرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کانفرنس میں جتنی قراردادیں منظور کی گئیں وہ سب پورے اتفاق اور یک جہتی کے ساتھ منظور ہوئیں اور عالم اسلام کے ان تمام رہنماؤں نے یک آواز ہو کر یہ اعلان کر دیا کہ بیت المقدس کے مسئلہ کا کوئی ایسا حل کسی قیمت پر دنیائے اسلام کے لئے قابل قبول نہیں ہو گا جس میں اس مقدس شہر کو مسلمانوں کی تحویل میں نہ دیا گیا ہو جن ممالک کے اب تک اسرائیل سے تعلقات ہیں وہ اپنے یہ تعلقات ختم کر دیں گے اور آئندہ بین الاقوامی مسائل میں تمام اسلامی ممالک باہمی صلاح مشورے سے مشترکہ لائحہ عمل اختیار کریں گے۔

پھر سب سے زیادہ مسرت کی بات یہ ہے کہ اس قسم کی کانفرنسیں عموماً لفظی قراردادوں پر ختم ہو جایا کرتی ہیں اور کوئی عملی اقدام نہیں ہو پاتا۔ لیکن اس کانفرنس نے ایک فیصلہ ایسا کیا ہے جس پر اگر ٹھیک ٹھیک عمل کیا گیا تو وہ عالم اسلام کی تازہ تاریخ میں ایک انقلابی اقدام کہلا سکتا ہے اعلان لاہور کے الفاظ میں وہ فیصلہ یہ ہے۔

"عالمی اقتصادی صورت حال اور بالخصوص اسلامی ممالک کی اقتصادی صورت حال کا اسلامی ممالک اور حکومتوں کے سربراہوں کی تقریروں اور بالخصوص سربراہ کانفرنس کے صدر، صدر الجزائر اور صدر لیبیا کی تقریروں کی روشنی میں جائزہ لینے کے بعد اور۔

(۱) اسلامی ممالک سے غربت، بیماری اور جہالت کے خاتمے۔

(۲) ترقی یافتہ ممالک کے ہاتھوں ترقی پذیر ممالک کے استحصال کے خاتمے۔

(۳) ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان خام مال کی تجارت

اور تیار شدہ مال اور فنی معلومات کی تجارت کی شرائط کو باضابطہ بنانے۔

(۴) قدرتی وسائل پر ترقی پذیر ممالک کے مکمل کنٹرول اور اختیار کی ضمانت دینے۔

(۵) قیمتوں میں حالیہ اضافہ کے سبب ترقی پذیر ممالک کو پیش آنے والے حالیہ اقتصادی مشکلات کو دور کرنے اور

(۶) مسلم ممالک کے مابین باہمی اقتصادی تعاون اور استحکام پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے اسلامی ممالک نے فیصلہ کیا ہے کہ الجزائر، مصر، کویت، لیبیا، پاکستان، سینگال، اور متحدہ عرب امارتوں کے نمائندوں اور ماہرین پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی جائے اور اس کمیٹی کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ دلچسپی رکھنے والے دوسرے ممالک کو بھی، اس میں شامل کرے۔ یہ کمیٹی مندرجہ بالا مقاصد کے حصول اور ممبر ممالک کے عوام کی بہبود کے لئے طریقے اور وسیلے تلاش کرے گی۔ انہوں نے کمیٹی کو ہدایت کی کہ وہ اپنی تجاویز فوری غور و خوض اور کارروائی کے لئے وزرائے خارجہ کی آئندہ کانفرنس میں پیش کریں۔

"سکریٹری جنرل کی دعوت پر اس کمیٹی کا اجلاس جدہ میں ہو گا سیکرٹری جنرل اجلاس کی تاریخ مقرر کرے گا۔ اجلاس کانفرنس کے خاتمے کے بعد ایک ماہ کے اندر اندر بلایا جائے گا۔"

ہماری رائے میں اس فیصلے کو پوری کانفرنس کا حاصل کہنا چاہئے اور اگر اس کمیٹی نے پورے ملی شعور، فنی مہارت اور حکمت و بصیرت کے ساتھ کام کیا تو انشاء اللہ اس اقدام کے بہت دور رس نتائج نکلیں گے۔

اس وقت ظاہر اسباب میں اسلامی ممالک کی زبوں حالی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ فنی طور پر پسماندہ ہونے کے سبب بڑی طاقتوں کے دست نگر ہیں قدرتی وسائل کی ریل پیل کے باوجود ان سے استفادہ کرنے کے لئے ترقی یافتہ ممالک کے ماہرین کے محتاج ہیں جو ان سے من مانی شرائط پر معاملہ کرتے ہیں اور انہیں ہر روز ایک نئے بندھن میں جکڑنے کی فکر میں رہتے ہیں، چنانچہ جو قدرتی وسائل اسلامی ممالک میں پیدا ہوتے ہیں ان کا بیشتر تجارتی نفع ترقی یافتہ

ممالک کی جیب میں جاتا ہے اور جب فنی مہارت کی کاریگری سے وہ خام وسائل تیار مصنوعات کی شکل اختیار کرتے ہیں تو ان کی قیمت اتنی گراں ہوتی ہے کہ اسلامی ممالک کی قوت خرید جواب دے جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم ممالک کا بال بال ان طاقتوں کے ہاتھ میں بندھا ہوا ہے جو انہیں اپنے سیاسی معاشی اور تجارتی مفادات کے حصول کے لئے کھلونا بنائے ہوئے ہیں۔

ان حالات میں اگر عالم اسلام بڑی طاقتوں کے چنگل سے آزاد ہو کر کوئی ایسا اقدام کرنا بھی چاہے جو اس کی قومی و ملی غیرت کے مطابق ہو تو وہ ان اقتصادی بندھنوں کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتا اور اس طرح معاشی اور فنی احتیاج کی اس قربان گاہ پر مسلمانوں کے تمام سیاسی حقوق ان کی ملی غیرت کے تمام تقاضے اور ان کی عزت و آزادی کے تمام حوصلے ذبح ہو رہے ہیں۔

لہٰذا مسلمانوں کے سیاسی مسائل کے حل کرنے کے لئے کوئی عملی اقدام اس وقت تک کارگر نہیں ہو سکتا جب تک پہلے ناخن تدبیر سے اس معاشی جال کے پھندے نہ کاٹے جائیں جو بڑی طاقتوں نے پورے مکر و فریب کے ساتھ ان پر تان رکھا ہے۔ مسلم ممالک اگر سیاسی طور پر اپنے حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا راستہ بھی اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ باہمی اتحاد تعاون، نظم و ضبط، کفایت شعاری اور ذہانت و بصیرت کے ساتھ معاشی اور فنی میدان میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور خود اپنے قدرتی وسائل سے خاطر خواہ استفادہ کی صلاحیت پیدا کریں۔ جس دن یہ کام ہو گیا انشاء اللہ وہ عالم اسلام کی عملی غلامی کا آخری دن ہو گا اور پھر وہ اپنے قومی مسائل کو حل کرنے کے قابل ہو سکیں گے البتہ شرط یہ ہے کہ وہ ان مادی ترقیات کی طرف کماحقہ توجہ دینے کے ساتھ ساتھ اپنے اس دینی رشتے کو عملاً مضبوط کرنے کی بھی کوشش کریں جس نے مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک کے ان مختلف رنگ و زبان کے رہنماؤں کو شاہی مسجد کے فرش پر زانوں سے زانوں ملا کر بیٹھنے کی سعادت عطا کی ہے۔

بہرکیف! اقتصادی کمیٹی کا قیام سربراہ کانفرنس کا سب سے زیادہ اہم، دور رس اور قابل تبریک فیصلہ ہے اور تمام مسلمانوں کو دعا کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس کمیٹی کے ارکان کو ایسی فراست و بصیرت عطا فرمائے جس کی روشنی میں وہ عالم اسلام کی بہبود کے لئے موثر راستے تلاش کر سکیں۔ آمین ثم آمین۔

انقلاب بنگال

بنگلہ دیش میں انقلاب آ گیا، شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے اہل خاندان قتل کر دیئے گئے، مشتاق احمد خوند کرنے اقتدار سنبھال لیا، ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔۔۔ اللہ اکبر چند سالوں کے مختصر عرصے میں بنگال کے اس علاقے نے تعزمن تشاء و تذل من تشاء کے کتنے مظاہرے ان گنہگار آنکھوں کو دکھائے ہیں۔ ایک شیخ مجیب الرحمٰن ہی کی زندگی عبرتوں کی کیسی پہلو دار داستان ہے؟ ایک طالب علم لیڈر سے لے کر ایک مقتول و معزول صدر تک ان کی زندگی کتنے مختلف عنوانات سے عبارت ہے، کبھی اگرتلہ کیس کا ملزم، کبھی گول میز کانفرنس کا ہیرو، کبھی چھ نکات کا نقیب، کبھی متحدہ پاکستان کا متوقع وزیر اعظم، کبھی مشرقی پاکستان میں ایک بے ضابطہ متوازی حکومت کا ... مطلق العنان فرماں روا، کبھی یحیٰی خاں صدر اور وہ قیدی اور کبھی وہ صدر اور یحیٰی خاں قیدی، کبھی موت کے منہ میں اور کبھی کرسی صدارت پر، کبھی حکومت پاکستان کا غدار اور کبھی بنگلہ دیش کے صدر کی حیثیت میں حکومت پاکستان ہی کا معزز مہمان ـــــ، اور بالاخر ان تمام ڈرامائی انقلابات سے گزر کر اب وہ خود اپنے چاہنے والوں اور اپنے ان رفقاء کی گولیوں کا نشانہ بن گیا جنہوں نے اسے جیل کی کوٹھری میں اپنا صدر تسلیم کیا تھا!!

انقلاب اور اس کے بعد کے حالات کی خبریں ابھی تک اتنی ناتمام اور بعض اوقات متضاد موصول ہو رہی ہیں۔ کہ ان کی بنیاد پر اس انقلاب کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنا

مشکل ہے۔ تاہم چند باتیں بالکل واضح ہیں۔

ایک بات تو یہ ہے کہ یہ انقلاب شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے مخصوص حواریوں کی اسی پالیسی کا رد عمل ہے جس نے بنگلہ دیش کو بھارت کے ہاتھ گروی رکھ دیا تھا۔ ہمیں سیاست میں بصیرت رکھنے کا کبھی دعویٰ نہیں ہوا لیکن جو راستہ شیخ مجیب اور ان کے حواریوں نے اختیار کیا تھا وہ سیدھا اسی انجام تک جاتا تھا چنانچہ سقوط مشرقی پاکستان کے فوراً بعد جب بنگال میں مجیب کے نام کا کلمہ پڑھا جا رہا تھا، ہم نے اسی وقت لکھ دیا تھا کہ:۔

"ابھی تو مکتی باہنی اور اس کے لیڈر ہندوستانی سنگینوں کے سایہ میں فروکش ہیں جب یہ سایہ چھٹے گا، حقائق نکھریں گے اور عوام کو فریاد کی آزادی ملے گی، اس وقت یہ فیصلہ تو تاریخ ہی کرے گی کہ اہل بنگال کے لئے اعظم خان او ٹکا خان زیادہ بڑے ظالم تھے یا مکتی باہنی اور اس کے ہم نوا؟ بنگالی عوام کا استحصال باہر کے لوگوں نے زیادہ کیا تھا یا ان بنگالیوں نے جنہوں نے پورے بنگال کو ہندوستان کا غلام بنا کر اسے نصف صدی پیچھے دھکیل دیا ہے۔ (البلاغ ربیع الاول ۱۳۹۲ھ)

چنانچہ آج شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے پورے خاندان کا صفایا کرنے والے ایوب خان، یحییٰ خان، یا ذوالفقار علی بھٹو نہیں، بلکہ اسی "سونار بنگلہ" کے باسی ہیں جسے شیخ مجیب یا ان کی مکتی باہنی نے "بیرونی حکمرانوں" سے "نجات" دلائی تھی۔ پھر اس سے زیادہ عبرت ناک بات یہ ہے کہ آج بنگلہ دیش کی مجیب کی موت پر آنسو بہانے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے۔ اس سے اس کے سوا اور کیا نتیجہ نکلتا ہے کہ بنگلہ دیش کے عوام کا اجتماعی ضمیر مجیب کی بھارت نواز پالیسیوں سے سخت متنفر اور نالاں تھا، اور اب وہاں کے عوام یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کے ساتھ بنگلہ قومیت کے نام پر کتنا بڑا فراڈ کھیلا گیا ہے۔

دوسری بات جو اس انقلاب سے واضح ہوتی ہے وہ تاریخ کے اس فیصلے کی تصدیق ہے کہ جو مسلمان رہنما اپنے مسلمان بھائیوں سے بگاڑ کر غیر مسلم حکومتوں سے اپنا مستقبل وابستہ کرتے ہیں انہیں دنیا ہی میں اپنے اس عمل کی سزا مل جاتی ہے۔ اسلام کی تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں، اور اب شیخ مجیب کا دردناک انجام بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

تیسرے اس انقلاب نے ایک بار پھر یہ بات واضح کر دی ہے کہ مشرقی بنگال کا یہ علاقہ دراصل اسلام اور مسلمانوں کا علاقہ ہے۔ اس کا اصل رشتہ ہندوؤں اور کافروں کے ساتھ

نہیں، عالم اسلام کے ساتھ ہے اور نیشنلزم، سوشلزم اور سیکولرزم کا جو مصنوعی خول اس پر بزرو شمشیر چڑھایا گیا تھا، وہ رفتہ رفتہ اتر رہا ہے شروع میں یہ واضح اعلان منظر عام پر آیا تھا کہ "عوامی جمہوریہ بنگلہ دیش" کا نام تبدیل کر کے "اسلامی جمہوریہ بنگلہ دیش" کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ بعد میں اس بارے میں کچھ متضاد خبریں بھی آئی ہیں، لیکن نئے صدر کی طرف سے سب سے پہلے اسلامی سربراہ کانفرنس کے ساتھ رابطہ کا اعلان اور ان کی تقریروں بیانات اور اقدامات کا رخ صاف بتا رہا ہے کہ وہ بنگلہ دیش کی پالیسی میں فوری طور سے کس انقلابی تبدیلی کا اعلان نہ کر پائیں، لیکن ان کا اصل مقصد بنگلہ دیش سے بھارت کا تسلط رفتہ رفتہ ختم کر کے اسلامی ممالک سے تعلقات استوار کرنا ہے۔

بنگلہ دیش کی نئی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ وہ نیشنلزم، سوشلزم اور سکولرزم کے سابقہ اصول بدستور برقرار رکھے گی، آئین میں بھی کوئی ترمیم نہیں کی جائے گی اور بھارت کے ساتھ تعلقات و معاہدات بھی حسب سابق باقی رہیں گے۔ لیکن اگر نیت بخیر ہو تو ان اعلانات کی توجیہ مشکل نہیں۔ بنگلہ دیش کی حکومت اس وقت انتہائی نازک دور سے گزر رہی ہے، شدید معاشی بدحالی سے دوچار ہونے کے علاوہ۔ اس کی فوج کی نفری انتہائی کم ہے جب کہ اس کی سرحدوں کی پوزیشن ایسی ہے کہ ان کی حفاظت کے لئے بھاری تعداد کی ضرورت ہے خود ملک میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ایسے حالات میں جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہے، اور تدریج سے کام نہ کیا جائے تو عزائم کی ساری بساط الٹ سکتی ہے۔ لہٰذا بنگلہ دیش کی نئی حکومت کے یہ اعلانات فی الحال اتنے قابل ملامت نہیں ہیں اور ان سے اس بات پر استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ یہ انقلاب محض سربراہ کی تبدیلی سے عبارت ہے۔ اور نظری و عملی حیثیت سے وہاں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

البتہ بنگلہ دیش کے معاملہ میں پورے عالم اسلام پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ یہ پوری اسلامی دنیا کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کے اس خطے کو بھارت کا نوالہ تر بنانے سے بچائے اسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لئے ہر قسم کی امداد دے اور اپنے طرز عمل سے یہ واضح کر دے کہ کسی بھی قسم کی بیرونی مداخلت کی صورت میں وہ تنہا نہیں ہو گا۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اسلامی سکریٹریٹ کے سرگرم ہونے کے بعد سے کرۂ ارض پر اسلامی اتحاد کا ایک وزن محسوس کیا جانے لگا ہے اور اگر اسلامی ممالک اخلاص اور لگن کے ساتھ سات کروڑ مسلمانوں کے اس وطن کو بھارت کے چنگل سے آزاد کرنے کے لئے کام کریں گے تو

انشاء اللہ بھارت کو کسی جارحانہ اقدام کی جرأت نہیں ہوگی۔ اس سلسلے میں حکومت پاکستان نے جس انداز سے پہل کی ہے وہ بڑی اطمینان بخش ہے اللہ تعالیٰ بنگلہ دیش کی حکومت و عوام اور پوری اسلامی دنیا کو اپنے فرائض سوجھ بوجھ کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

محمد تقی عثمانی

۳۰ شعبان [illegible]ھ

تصانیف

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

- آسان نیکیاں
- اندلس میں چند روز
- اسلام اور سیاست حاضرہ
- اسلام اور جدت پسندی
- اصلاحِ معاشرہ
- اصلاحی خطبات ———— (۹ جلد)
- احکامِ اعتکاف
- اسلام اور جدید معیشت و تجارت
- اکابر دیوبند کیا تھے؟
- بائبل سے قرآن تک
- بائبل کیا ہے؟
- تراشے
- تقلید کی شرعی حیثیت
- جہانِ دیدہ ———— (بیس ملکوں کا سفرنامہ)
- حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق
- حجیتِ حدیث
- حضورؐ نے فرمایا ———— (انتخاب حدیث)
- حکیم الامت کے سیاسی افکار
- درسِ ترمذی ———— (۳ جلد)
- دینی مدارس کا نصاب و نظام
- ضبطِ ولادت
- عیسائیت کیا ہے؟
- علوم القرآن
- عدالتی فیصلے
- فرد کی اصلاح
- فقہی مقالات ———— (۳ جلد)
- مآثرِ حضرت عارفی
- میرے والد میرے شیخ
- ملکیتِ زمین اور اس کی تحدید
- مطابق سنت نماز بخوانید
- نقوشِ رفتگاں
- نفاذِ شریعت اور اس کے مسائل
- نمازیں سنت کے مطابق پڑھیئے
- ہمارے عائلی مسائل
- ہمارا تعلیمی نظام
- ہمارا معاشی نظام
- تکملۃ فتح الملہم شرح صحیح مسلم ۶ جلد ———— (عربی)
- ما هي النصرانية؟ ———— (عربی)
- نظرة عابرة حول التعليم الإسلامي ———— (عربی)
- أحكام الأوراق النقدية ———— (عربی)
- بحوث في قضايا فقهية معاصرة ———— (عربی)

The Authority of Sunnah
The Rules of I'tikaf
What is Christianity?
Easy Good Deeds
Perform Salah Correctly.

فون ۵۰۴۲۲۸۰

پوسٹ کوڈ ۷۵۱۸۰